Regd. L. No.7243
Phone 8806[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1984

اس پرچہ میں

(۱) اسلامی نظام کسطرح قائم ہوگا؟
(۲) بے تیغ سپاہی

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ۔لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴	خط و کتابت	سالانہ
چار روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان ۴۸/ روپے غیر ممالک ۹۸/ روپے
شمارہ ۱۲	دسمبر ۱۹۸۴ء	جلد ۳۷

فہرست

۱۔ لمعات :- نذرانۂ عقیدت بحضورِ رسالتمآبؐ ——— ۳

۲۔ اسلامی نظام کس طرح قائم ہوگا؟ (پرویز صاحب کا خطاب) ——— ۱۰
بتقریب سعید عید میلاد النبیؐ

۳۔ بے تیغ سپاہی (پرویز صاحب کا ایک خطاب) ——— ۳۴
بتقریب یوم پیدائش قائدِ اعظمؒ

۴۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ——— ۶۱

۵۔ قرآنی درس کے اعلانات ——— ۶۳

ایڈیٹر محمد خلیل :- ناشر شیخ عبدالحمید - ناظم اشاعت - ۲۵/ بی گلبرگ ۲ لاہور - مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹، ایبک روڈ لاہور

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو
آنکه از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بهاست
یا هنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۵

لمعات

نذرانۂ عقیدت
بحضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم)

یوں تو طلوعِ اسلام کی ہر اشاعت، قرآن اور صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) کے تذکار جلیلہ کی آئینہ بردار ہوتی ہے، لیکن ربیع الاول کا مہینہ نوعِ انسان کے لئے جس خیر و برکت کا ضامن اور یمن و سعادت کا مہین ہوتا ہے اس کے پیشِ نظر اس ماہ سے متعلق اشاعت میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے سلسلہ میں خصوصی نذرانۂ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی تجسس و کاوش کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ پرویز صاحب کی مایۂ ناز اور منفرد تصنیف "معراجِ انسانیت" میں گہرہائے عقیدت انبار در انبار اور گلہائے مدحت روش در روش موجود ہیں۔ ہم اُسی کلبۂ گل فروش و دامانِ باغباں کی خوشہ چینی سے چند بہ گلہائے خوش رنگ پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

وہ آئے بزم میں ......

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے تھی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ جس مٹی کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جو انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے مدور تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اُجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و نا امید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار کر کہتی تھی کہ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس ربِ دو عالمین کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاول

کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور ریگ زارِ عرب کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ معاشرت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی باد سموم، عدل و احسان کی جان بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہو گئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بخت بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذروں کو اس ذاتِ اقدس و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہوئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، ناسوت و لاہوت یہ اور وہ قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ نوامیسِ فطرت نے "جنت" سے نکالے ہوئے ابنِ آدمؑ کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا کے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آ گیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا، نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمی کی تکمیل کا دن آ گیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آ گیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا — إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (۴۶-۴۵/۳۳) وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَٰلَ ٱلَّتِى كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے طوق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس، طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا۔ اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور بادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است   سلوکش عشق و مستی را عیار است
مکاں مش عبدہٗ آمد و لیکن   جہانِ شوق را پروردگار است

إِنَّ ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن ... (۵۰/۳۷)

اسی طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر رہا ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا!

جب مشیتِ ایزدی کی تعمیلِ حکم جس کے لئے زمین و آسمان یوں قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ چکی

انسانیت، جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکّر دیئے تھے گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دُھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادہ پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے رازہائے درونِ پردہ کے صدف لعل و گہر کو اپنے اندر سمولے، تو آسمان کی حوریں زمین پر اُتریں کہ جنّت کے پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کر دیں۔ چمن گلستان کا موسمِ بہار آگیا۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے۔ آسمان سے نُور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ کی تفسیر ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصوّر لیں کر چپکنے لگی۔ فلک، تعظیم کے لئے جُھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اُٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اُٹھے۔ بطحا کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تیمن پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکینِ خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبر اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں آیا، اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے نغمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی صدہ فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اُٹھی اور انس و جہان وجد و کیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا　　اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو　　در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

در جہاں ذکر و فکرِ انس و جاں　　تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

مقامِ محمدیؐ

یہ آنے والا، رسول کافّۃً للناس اور رحمۃ للعالمینؐ بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اس کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام پر بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ پر اُتاری گئی۔ مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطربیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کی رہینِ منّت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمانؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں سجایا گیا۔

پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور انہی درخشندہ و تابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کی حقیقی آب و تاب کہاں کے ستائش گروں کی فرطِ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جواہر الگ الگ پڑے تھے۔ یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہوگئے تھے جو

ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے یہ خط مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است — رحمۃ للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری شمع، مادی ضرورت اور کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذات اقدس و معظم کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر صاحب بصیرت پکار اٹھتا ہے کہ

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہ مصطفےٰ رو

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى

طلسم نہایت آں کہ نہایت ندارد — بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے

قلب وادیٔ فاران یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ ایرجاکف و باد کے لئے مرکز قلب و نظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ زار حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حریم کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے طفلک و برنا و پیر، نزد و دور، کاروان در کاروان اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لئے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجع انام کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ جبین شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلب نیاز جذبہ ہائے تعبد سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ و تاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ و تاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروان حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کئے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر، سفر ختم ہونے کے باوجود ذوق سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پہ جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا جام و سبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنج گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے دل کو اپنی مٹھی میں لئے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے نزاں اشکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتش انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزم شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفل عیش و طرب ہے یا میدان جنگ و جدل ہر شخص پورے جذب و انہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس لہو و لعب اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر، یوں مستغرق ہوتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جا سکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد، عورت سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہیں گویا یہ کھیل ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔

لیکن مکہ کی ان پُر ہجوم گلیوں میں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریقِ احسن کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کچھ خلا سا محسوس کرتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔ وہ مشاغل و مشارب، جو اس کی قوم کا جزوِ زندگی بن چکے ہیں، اس کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ کبھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے ہجوم رقصاں لے کر حریمِ کعبہ تک جاتا ہے لیکن وہاں گھڑی دو گھڑی کے بعد ناچار آزردہ کو اسی طرح واپس لے آتا ہے کہ وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی چوکھٹیں اس متاعِ گراں مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتیں۔ جب وہ انسانوں کی گردنوں کو ان کی خود تراشیدہ مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ —— یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہرچند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے کردار کو کوئی دخل نہ ہو وہ باعثِ فخر و تکبر ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کا قلبِ سلیم اِبا کرتا ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں —— وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لئے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کون سی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن ان سے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصلی روشنی کو ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی آہ بھر کر اٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رجوع کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اسے تلاش ہے۔ لیکن اسے ان کا ذوق تشنہ اور ترتیب خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا ماجرا کہہ سکے۔

وہ اس تنہائی سے اُکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ ——

درین میخانہ اے ساقی ندارم محرمے وائے   کہ من شاید نخستیں آدم از عالمے دیگر

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ نگاہ اسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و فکر دیتی ہے اور گاہ ماہِ عالمتاب کی درخشندگی سامانِ تدبر و تفکر پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آ گیا؟ کون اسے اس حسن و خوبی سے چلا رہا ہے؟ اس کا بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیٔ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اس قدر ہے کہ وہ اگ دبی

اضطراب کو۔ اپنے معمولاتِ زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے کاروباری معاملات، اہل بچوں کی نگہداشت، رفقاء و احباب سے میل ملاقات، معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا۔ اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مداح ہیں اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قوم اور خاندان کو اس کی شرافت و اصابت پر ناز ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے۔ اس لئے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لئے وجہ اطمینان اور موجب تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر آن کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب و بے قرار پاتا ہے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے؟ کارلائل کے الفاظ میں :-

اور شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے :-

میں کیا ہوں؟   کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟   زندگی کیا ہے؟   موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی وحی سے ملتا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنا لے۔

HEROES AND HERO—WORSHIP P. 49

ہاں، ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ اور نبی قبل از نبوت وحی سے واقف نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت قبل از بعثت حضورؐ کی تھی۔

نبوت خالصۃً خدا کی موہبت ہوتی تھی جس میں ہونے والے نبی کے اپنے عمل یا کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ خدا جس ذات کو اس منصب جلیلہ کے لئے منتخب کر لیتا تھا، اسے اپنے پروگرام کے مطابق، ایک وقت معینہ پر نبوت عطا کر دیتا تھا یہی وجہ تھی کہ نبی کو قبل از نبوت، وحی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ (حضورؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا)۔

مقامِ نبوت

نبوت کا مقام اس قدر عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تصور سے روح میں بالیدگی، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا، قلب میں روشنی، طبعوں میں حرارت، بازوؤں میں قوت، ماحول میں درخشندگی، فضا میں تابندگی، اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ نبی کا پیغام انقلاب آفریں دین و دنیا کی سرفرازیوں اور سربلندیوں کا امین ہوتا ہے۔ وہ مُردوں کی بستی میں صور اسرافیل پھونک دیتا ہے۔ اس سے قوم کے عروق مفلوج میں پھر سے خونِ حیات رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ وہ اپنی ملت کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور ان کے ایک ہاتھ میں زمین کی خلافت اور دوسرے میں آسمان کی بادشاہت دے دیتا ہے۔ وہ اپنی ہوش ربا تعلیم اور محیر العقول عمل سے باطل کے تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں اکھیڑ کر آئین کائنات کو ضابطۂ زندگی پر متشکل کر دیتا ہے۔ اس سے زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ اور آرزوئیں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتی ہیں۔ ولولے جاگ پڑتے ہیں۔ ایمان کی حرارتیں دلوں میں سوز اور جگر میں گداز پیدا کرتی ہیں۔ روح کی مسرتوں کے چشمے ابلتے ہیں۔ قلب و جگر کی نورانیت کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ ستارہ امید کا

کی کلیاں مسکراتی ہیں۔ زندہ مقاصد کے غنچے چٹکتے ہیں اور اس خوش بخت قوم کا یہ چمن دامانِ صد باغبان و کفِ گلفروش کا فردوس اپنا منظر پیش کرتا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اس کا نصب العین اور قوانینِ خداوندی کا نفاذ اس کا مقصدِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ جب اس کے باشندوں عملی اقدامات کا تختہ [illegible] کی ہر خارقِ قوت پہاڑوں کے غاروں میں سرپا ٹپکتی پھرتی ہے۔ جور و استبداد کے قصر [illegible] کے کنارے [illegible] طغیان و سرکشی کے [illegible] ہیں۔ وہ اپنے رفقا کی معدودی [illegible] کے ساتھ اعلائے کلمۂ حق کے لئے باہر نکلتا ہے تو فتح و نصرت [illegible] نصرت و کامرانی اس کے جلو میں آتی ہے۔ [illegible] اس کے خدائے واحد القہار کا کلمہ [illegible] ہیں اور خدا اور اس کے فرشتے اس انقلاب آفریں ملکوتی کارناموں پر تحسین و تبریک کے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۔

قرآن و سیرت

آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت سے مقصود و مطلوب کیا ہے؟ اس کی تشریح و توضیح میں کتابوں پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر اسے مجملاً چند الفاظ میں سمجھنا ہو تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ افراد اپنی تمدنی اور معاشی زندگی یعنی ہیئت اجتماعیہ کو کس طرح ازلی اقدار سے ہم آہنگ رکھ سکتا ہے جو ایک ہمہ گیر آفاقی ضابطۂ قوانین کی حیثیت سے کارگۂ ہستی کو اس نظم و ضبط، توازن و اعتدال اور حسن و رعنائی سے نہ صرف سرگرمِ عمل رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کے تعمیری [illegible] کو بروئے کار لاکر اسے تخلیقی ارتقاء کے مراحل طے کراتے ہوئے رفتہ رفتہ جانبِ منزل لئے جا رہی ہیں۔ قرآن میں اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف اور حضرات انبیائے کرام کے تذکار جا بجا ہیں۔ یہی بتانا مقصود ہے کہ جب انسان نے اپنے تمدنی و معاشی نظام زندگی یعنی حیات اجتماعیہ کو آفاقی قوانین سے الگ کر لیا تو اس کا نتیجہ زندگی کی ان ناہمواریوں کی شکل میں سامنے آگیا جسے وہ فساد کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے کاروانِ انسانیت اشرفِ رفعت کی بلندیوں کی طرف جانے کی بجائے سبعیت و بہیمیت کی پستیوں کے جہنم میں جا گرا۔ اور اس کے برعکس جب انہوں نے اپنی زمینی زندگی (حیاتِ ارضی) اور آسمانی اقدار میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کر لی تو کس طرح زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی اور عالمِ انفس و آفاق میں [illegible] شگفتگی و شادابی کی جنتیں لہلہا کر زمین بن گئیں۔ نبی اکرمؐ کے وقت یہ فساد اپنی وسعتوں اور گہرائیوں کے اعتبار سے پوری شدت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن تاریخِ انسانی کے محسنِ اعظمؐ اور آسمانی انقلاب کے اس داعیِ اکبرؐ کے تئیس سالہ سعی و عمل سے انسانی نظامِ حیات کے یہ تمام ناہموار گوشے یکسر ہمواریوں اور استواریوں میں بدل گئے۔ اور انسانیت نے اس فردوسِ گم گشتہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے متبسم رعنائی و شادابی دیکھ لیا جس کی تلاش میں وہ قرنہا قرن سے حیران و سرگرداں پھر رہی تھی۔ لہٰذا سیرتِ محمدیہ درحقیقت تاریخ ہے اس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اس ذلت آمیز و کرب انگیز جہنم سے نکل کر جس میں اسے ملوکیت کی مستبدانہ دراز دستیوں، پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور سرمایہ پرست گروہوں کی سفاکانہ خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا، بلندیوں اور ہمواریوں کی اس روح پرور اور نشاط انگیز جنت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمرباری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ۔ اس شجرِ طیب کی طرح جس کی جڑیں زمین میں محکم و استوار ہوں اور جس کی شاخیں آسمانی جنت در آغوش فضاؤں میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں۔ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بتقریب سعید عید میلاد النبیؐ

اسلامی نظام کس طرح قائم ہوگا؟

(پرویز صاحب کا خطاب)

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم

ہم اپنی اس خوش نصیبی پر جس قدر بھی نازاں ہوں کم ہے کہ ہمیں ایک بار پھر اُس محفلِ حیات بخش میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ہے جس میں اُس ذاتِ اقدس و اطہر کا تذکرۂ جمیلہ وجہ نشاطِ روح اور باعث نزہتِ خاطر ہوتا ہے جس کا ظہورِ قدسی عالمِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کا مظہر ہے۔ بعض حقیقت ناآشنا سطح بین لوگ کہتے ہیں کہ رسولؐ کی حیثیت (معاذاللہ) ایک ڈاکیہ کی سی ہوتی تھی جس کا فریضہ خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچا دینا ہوتا تھا اور بس۔ یہ خیال بنیادی طور پر غلط ہے اور یہ عقیدہ باطل۔ رسول کا فریضہ صرف خدا کا پیغام دوسروں تک پہنچا نا نہیں ہوتا تھا۔ اس پیغام کے مطابق ایک معاشرہ، ایک نظام، ایک مملکت قائم کر کے دنیا کو محسوس طور پر دکھانا بھی ہوتا تھا کہ اس پیغام پر عمل کرنے سے اس قسم کا معاشرہ وجود میں آئے گا جس میں انسان اس دنیا میں بھی جنت کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ ہم نے پاکستان کا خطۂ زمین اسی قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ لیکن ہماری بدنصیبی کی انتہا ہے کہ اس قسم کے نظام کا قیام تو ایک طرف، یہاں ابھی تک یہی طے نہیں پایا کہ وہ نظام ہوتا کیا ہے؟ اس کے لئے مجالس مذاکرات قائم ہوتی ہیں۔ سیمینار منعقد کرائے جاتے ہیں۔ دانشورانِ قوم بالخصوص قانون دان حضرات میں بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ان تمام کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ:

ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں

ہماری اس سعیٔ لاحاصل کو علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ:

از رموزِ گاہِ خویش ندانم، جز ایں قدر خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزوست (پیامِ مشرق)

اسلامی نظام کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ ہم متعین طور پر سمجھیں کہ اسلام کیا ہے۔ اگر یہ بات سمجھ میں آجائے تو اسلامی نظام، اسلامی مملکت، اسلامی قوانین، اسلامی شریعت، غرضیکہ اسلام کے متعلق سب کچھ بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔

اسلام کیا ہے؟

اسلام کے متعلق اگر ہم اپنی ذہنی اختراعات یا تقلیدی مباحث سے ہٹ کر براہِ راست اللہ تعالیٰ سے پوچھیں تو اس باب میں نہ کوئی شک و شبہ رہ سکتا ہے نہ التباس و ابہام۔ اس لئے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶)۔ "جب بھی ہمیں کوئی پکارتا ہے تو ہم اس

کی پکار کا جواب دیتے ہیں"۔ اسلام کیا ہے کا جواب خدا نے اپنی . . . کتاب عظیم میں ان چار الفاظ میں دے دیا ہے کہ؛

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا مسلم وہ ہیں جو اپنے تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرتے ہیں اور اسلام نام ہے کاروبارِ حیات کو قرآن مجید کے مطابق سرانجام دینے کا۔ میں نے اس اصول کی روشنی میں ایک بار اسی تقریبِ سعید کے خطاب میں یہ بتایا تھا کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں۔ آج کی نشست میں میں اس راستے پر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی نظام قائم کس طرح سے ہوگا؟ اس موضوع کی اہمیت کی وضاحت کے سلسلے میں اس مثال کو دہرا دینا چاہتا ہوں جو طلوعِ اسلام کی اشاعت (بابت فروری ۱۹۸۱ء) میں برجستہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

ایک مثال

آپ نے ہاکی کے میدان کو دیکھا ہوگا۔ اس کی حدود و قیود خاص قواعد و ضوابط کے مطابق متعین کی جاتی ہیں لیکن وہ میدان مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہاکی کی ٹیم اس میں آکر اپنے جوہروں کی نمود کرے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر کوئی قوم سارا وقت ہاکی کے میدان کے طول و عرض کی بحثوں میں صرف کر دے لیکن ہاکی کی ٹیم تیار کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اگر وہ اس میدان کی حدود و قیود کا صحیح طور پر تعین بھی کر لے لیکن اس کے یہاں ہاکی کی ٹیم نہ ہو تو ان کی ان کاوشوں سے حاصل کیا ہوگا؟ اوّلین کام ہاکی کی ٹیم تیار کرنا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہمیں خود حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ سے لگ سکتا ہے۔

حضورؐ کی مکّی زندگی

مغرب کے مستشرقین کا عام خیال یہ ہے کہ جب تک حضورؐ مکہ میں رہے آپؐ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے جو درحقیقت فریضۂ نبوت تھا۔ اور تشکیلِ مملکت کا خیال مدینہ جا کر پیدا ہوا جب وہاں کی فضا اس کے لئے سازگار نظر آئی۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ فریضۂ نبوت محض وعظ و نصیحت نہیں تھا۔ قرآن کے متعین کردہ نقشے کے مطابق نظامِ اسلامی یا اسلامی مملکت کا قیام تھا۔ اور یہ مقصد مکہ کی زندگی میں روزِ اوّل ہی سے حضورؐ کے پیشِ نظر تھا۔ یہ حقیقت متعدد تاریخی شواہد سے واضح ہے۔ (مثلاً) تاریخ الکامل ابن اثیر میں ہے کہ رسول اللہ نے اپنی دعوت کے آغاز میں خود اپنے اہلِ خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے ان میں ایک پیغام میں فرمایا تھا۔

> یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس حکومت کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

اس پیغام کو درج کرنے کے بعد ابن اثیر نے لکھا ہے کہ نبوت کے تیسرے سال آپ نے ان لوگوں کو "خدا کے حکم" کے لئے جمع ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ یاد رکھو کہ "یا تو خدا کا حکم غالب آ جائے گا اور یا میں اپنی جان سے گذر جاؤں گا"۔

اسی قسم کی بات آپ نے قبیلۂ عامر کے اس بوڑھے سردار کے سوال کے جواب میں کہی تھی جس نے حضورؐ سے پوچھا تھا کہ اگر میں آپ کی دعوت کو قبول کر لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ "جنت کے باغات"۔ اس نے کہا کہ

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل — نسیمِ صبح! تیری مہربانی

اسی لئے تو ارشادِ خداوندی ہے کہ:

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ۔ (49/17)

یہ خدا کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے تمہاری راہ نمائی منزلِ ایمان کی طرف کر دی۔

عالم گیر فساد

عزیزانِ من! جیسا کہ آپ نے میرے آج کے خطاب کے موضوع سے اندازہ لگا لیا ہو گا، میرے پیشِ نظر اس تباہی کا دلسوز اور جگر خراش تذکرہ ہے جو نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود ہے اور نہ کسی خاص قوم یا مملکت سے مخصوص۔ یہ اس جہنم کا جاں سوز قصہ ہے جس میں آج پورے کا پورا عالمِ انسانیت جھلس رہا ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ وہ اپنے سامنے نہیں پاتا۔ قرآنِ کریم نے اپنے زمانۂ نزول کی عالم گیر تباہی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ … (30/41)

کرۂ ارض پر، خشکی اور تری میں، ہر جگہ فساد برپا ہے اور یہ سب، لوگوں کا اپنا کیا کرایا ہے۔ اس کے ذمہ دار خود ان کے خود ساختہ نظامِ حیات ہیں۔

اُس زمانے میں، دنیا میں روم اور ایران کی دو سب سے اہم تہذیبیں تھیں۔ اور یہ دونوں پستیٔ اخلاق و کردار کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکی تھیں، ان پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ لیکن دنیا کی جو حالت آج ہو چکی ہے، اس میں اِس فساد کی وسعتیں حدود فراموش اور طغیانیاں ساحل ناآشنا ہیں۔ آج، وسائلِ رسل و رسائل کی عمومیت اور ذرائعِ مواصلات و ابلاغ کی عالمگیریت سے، ساری دنیا سمٹ کر ایک قطعۂ ارض بن گئی ہے۔ جس میں اُن انسانیت سوز خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ جن سے اس کا کوئی کونا کھدرا تک محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ کریم نے ایک آنے والے دور کے متعلق کہا تھا کہ: كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا۔ (76/7) "اس میں شر کی چنگاریاں فضا میں اُڑتی پھریں گی"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں، ہمارے ہی دور کی طرف اشارہ ہے جس میں اقبالؒ کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ——— شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب ——— اس میں شرق و مغرب سب اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ اس میں حالت یہ ہے کہ ——— عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ ——— اور اس کی وجہ ہے، یا یوں کہیے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ——— نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری ——— بہرحال یہ ہے وہ عالمگیر تباہی کا جہنم جس میں آج ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی راہ کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا اس قسم کا منظر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کبھی دیکھا ہو۔

اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے کہا تھا کہ:

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے — بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

یہ آج سے کوئی چالیس سال پہلے کی بات ہے، لیکن اس کے بعد، یورپ کے جراحت ہائے پنہاں کے درد

یہ آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مجھے اس دُنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپ نے فرمایا:۔

نعم۔ النصر و التمکین فی البلاد

خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔

لہٰذا، یہ نصب العین پہلے دن سے حضورؐ کے سامنے تھا۔ مکی زندگی اس نصب العین کے حصول کی تیاریوں کا مرحلہ تھا۔ یہ تیاریاں کس قسم کی تھیں، اس کی وضاحت قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس کے لئے حضورؐ

رفقاء کی تیاری

کو رفقاء کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا تھا: یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰہُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۸/۶۴) "اے رسول! اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے . . . . تمہیں بے شک نصرتِ خداوندی کی ضرورت ہوگی۔ لیکن تنہا یہ نصرت کافی نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ تمہیں ان رفقاء کی جماعت کی بھی ضرورت ہوگی جو تمہارے دست و بازو بنیں گے" اس جماعت اور اس کے سربراہ کو اللہ تعالیٰ نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ (۴۸/۲۹) کے تابندہ خطاب سے یاد فرمایا تھا۔ حضورؐ کی مکی زندگی انہی رفقاء کی تیاریوں کا زمانہ تھا اور اس کا نصاب، یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَ یُزَکِّیْھِمْ (۲/۱۲۹) "یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم اور مناسب تربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما" خدا آدمی پیدا کرتا تھا رسولؐ ان آدمیوں کو انسان بناتا تھا۔ میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ انسانیت سازی تھا۔ ؎

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید	وز رسالت درتنِ ما جاں دمید

یہ اسلامی نظام کے قیام کے پروگرام کی اوّلین اہم ترین اور فنڈامینٹل کڑی تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

من از طریق نہ پرسم رفیق می جویم	کہ گفتہ اند نخستیں رفیق باز طریق

اسی جہت سے حضور نبی اکرمؐ کو المزمّل کے حسین اور جامع لقب سے نوازا گیا۔ مزمّل کے معنے ہوتے ہیں وہ سالارِ کارواں

صحابہ کرامؓ

جو رفقائے کارواں کا صحیح انتخاب کرے۔ حضورؐ کے ان رفقائے کارواں میں تمام صحابہ کبارؓ بلا استثنا شامل ہیں۔ ان ہی کے ہاتھوں سے یہ نظام قائم ہوا اور آگے چلا تھا۔ نظامِ اسلام جب بھی دوبارہ قائم ہوگا اس کے لئے اوّلین شرط اسی قسم کی جماعتِ مؤمنین کا وجود میں لانا ہوگا۔ یاد رکھیے! کوئی شخص نہ حضورؐ کے زمانے میں پیدائشی مؤمن تھا نہ اب پیدائشی مؤمن ہوگا۔ حضورؐ نے بھی ضروری تعلیم و تربیت سے مؤمنین کی جماعت تیار کی تھی اور اب بھی اسی طریق سے مؤمنین کی جماعت کا تیار کیا جانا لازمی ہوگا۔ اسلامی نظام انہی کے ہاتھوں قائم ہو سکے گا۔

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ حضورؐ کی تیار کردہ جماعت میں تمام صحابہ کبارؓ شامل تھے۔ میرے لئے یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ میں ان سب کی سیرت و کردار کے نمایاں خط و خال پیش کر سکوں۔ مجھے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا

حضرت عمر فاروقؓ

اور یہ منتخب ہستی حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ میرے اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو خود نبی اکرمؐ نے انہیں خدا سے مانگ کر لیا تھا اور دوسرے یہ کہ اسلامی نظام انہی کے زمانۂ خلافت میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا تھا۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد حضور نبی اکرمؐ کے

مقدس ہاتھوں سے رکھا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس نوزائیدہ نظام کی، مخالفین کی یورشوں سے، مدافعت کی اور اس طرح اسے اس قابل بنا دیا کہ یہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مکمل شکل میں سامنے آجائے۔ میں نے اپنی کتاب "شاہکار رسالتؐ" میں اس دور کا پورا نقشہ مرتب کر کے ملت کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ میرا آج کا خطاب بھی اسی سے مقتبس ہے۔

دعائے نبویؐ

میں نے کہا ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو (یا یوں کہیئے کہ عمر ابن الخطاب کو) خدا سے مانگ کر لیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضورؐ نے خدا سے دعا کی تھی کہ

یا الٰہ العالمین! اسلام کو ابوجہل یا عمر ابن الخطاب کے ذریعے تقویت بخش ان دونوں میں سے جو بھی تجھے محبوب ہو اسے مشرف بہ اسلام فرما۔

ابوجہل، عمر ابن الخطاب کا ماموں تھا۔ ان دونوں کا معاشرہ میں کیا مقام تھا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی کیا کیفیت تھی اس کا اندازہ حضورؐ کی اس دعا سے لگ سکتا ہے۔ تعلیم و تربیت نبویؐ، انسانی صلاحیتوں کو جس قسم کی جلا دے کر انہیں حسن تقویم کا مظہر بنا دیتی ہے، اس سے عمر ابن الخطاب، فاروق اعظمؓ بن کر آسمانِ انسانیت پر مہر عالمتاب کی طرح، ایسے چمکا کہ اس کی ضوفشانیاں ابدالآباد تک وجہ تابندگیٔ عالم بن گئیں۔ اور ابوجہل اس سے محروم رہا تو جہالت کی زندگی جیا اور ذلت کی موت مرا۔

(حضرت) عمرؓ کے اسلام لانے کے متعلق ہمارے ہاں جو روایات عام طور پر مشہور ہیں وہ کچھ صحیح نظر نہیں آتیں۔

اسلام لانے کا واقعہ

کہا یہ جاتا ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ گلی میں سے گذر رہے تھے کہ ان کی ہمشیرہ کی زبان سے قرآن مجید کی چند آیات اتفاقاً آپ کے کان میں پڑ گئیں۔ پہلے تو ان کا ردِ عمل سختی اور درشتی کا تھا یہاں تک کہ انہوں نے اپنی بہن اور بہنوئی کو پیٹ بھی دیا لیکن بعد میں وہ ان سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے۔ یہ روایت اس لئے قرین قیاس نظر نہیں آتی کہ:

(۱) حضرت عمرؓ لکھے پڑھے تھے وہ ملک سے باہر دوسری اقوام کے زعمائے سیاست اور مشاہیر فکر و تدبر سے ملاقاتیں کرتے۔ ان کے ذوقِ تجسس کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے توراۃ کو براہ راست سمجھنے کے لئے عبرانی زبان سیکھی اور اس پر عبور حاصل کر لیا۔

(۲) حضور نبی اکرمؐ کی انقلابی دعوت چھ برس سے مکہ میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ حضورؐ خلوت و جلوت میں قرآنی پیغام کو عام کر رہے تھے۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ عمر ابن خطاب جیسا انسان اس دعوت کے مالہٗ و ماعلیہ سے بے خبر رہا ہو اور اس نے اس سے پہلے قرآنی آیات کو نہ کبھی سنا ہو نہ انہیں درخور اعتنا سمجھا ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ خود بیان کیا ہے۔ اسے غور سے سنیئے اور جھوم جایئے۔ ان کا بیان ہے:

جاہلیت میں، میں شراب کا رسیا تھا۔ ہر شب، ہم، یارانِ قدح خوار کی ایک رنگین محفل جما کرتی تھی۔ ایک رات میں گیا تو وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔ میں کئی ایک اور مقامات میں پہنچا لیکن اتفاق کہ شراب

مجھے وہاں بھی نہ ملی۔ اب میں نے سوچا کہ یوں گھر لوٹنے کی بجائے، کعبہ کا طواف ہی کرتا جاؤں۔ حریمِ کعبہ میں سناٹا تھا۔ دیکھا کہ ایک شخص تنہا محوِ عبادت ہے اور اونچی آواز سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ محمدؐ رسول اللہ ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ موقع اچھا ہے۔ دیکھوں کہ یہ شخص تنہائی میں کیا کرتا اور کیا کہتا ہے۔ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ محتاط تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں، اس لئے میں غلافِ کعبہ میں چھپ گیا اور سرکتا سرکتا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھ میں اور ان میں غلافِ کعبہ کے سوا کچھ اور حائل نہ تھا۔ آپ نہایت جذب و کیف کے عالم میں کھڑے، قرآن مجید کی یہ آیات پڑھ رہے تھے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ۔ ان الفاظ میں کچھ ایسا بلا کا اثر تھا کہ میں نے کہا کہ قریش جو کہتے ہیں کہ یہ شخص نہایت بلند پایہ شاعر ہے تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، کہ اتنے میں آپؐ نے اگلی آیت پڑھی کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ۔ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ۔ میں نے کہا کہ یہ تو اپنے شاعر ہونے سے بھی انکار کرتا ہے۔ تو پھر جیسا کہ قریش کہتے ہیں کہ یہ کاہن ہوگا، کہ اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے کہ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ قرآن کے اسلوبِ بیان نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے، نہ کاہن کا، تو پھر یہ ہے کیا؟ میرے دل کی اس بات کا جواب مجھے ان الفاظ میں ملا۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۹/۴۳-۳۸)۔ آپؐ یہ پڑھتے جا رہے تھے اور مجھ پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

بھیگی ہوئی رات، تاروں کی چھاؤں، حریمِ کعبہ اور اس میں کامل سکوت۔ اس سکون افزا ماحول میں خود صاحبِ قرآن کی زبانِ اقدس سے قرآن کی آیات کی تشدید روح پرور اکشش و محویت کے ان تمام عناصر کے حسین امتزاج نے وہ کیفیت پیدا کی جو ابنِ خطاب کے فکری ارتقاء کے نقطۂ عروج اور نفسیاتی تغیر کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کا موجب بن گئی۔ یہ وہ مقام تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر — کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر
خلوت کی گھڑی گذری۔ جلوت کی گھڑی آئی — چھٹنے کو ہے بجلی سے، آغوشِ سحاب آخر

اس مقام پر عمرؓ کی شدتِ شوق وہ فتیلہ بن گئی جس نے شکوک و شبہات کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا، اور ان کے نیچے، لاشعور میں پہلو بدلنے والے قیاسات کو یقینِ محکم کی شکل میں، شعور کی سطح پر لے آنے کا موجب بن گئی۔ (عمرؓ کا بیان ہے):-

رسول اللہ قرآن پڑھتے جا رہے تھے اور میں بے اختیار روتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے نماز ختم کر لی اور گھر جانے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ میں بھی دبے پاؤں آپؐ کے پیچھے ہو لیا۔ گھر کے نزدیک پہنچے تو میں قریب ہو گیا۔ آپؐ نے آہٹ پا کر مڑ کر دیکھا تو مجھے پہچان لیا اور پورے دبدبے کے ساتھ کہا۔

ابنِ خطاب! تم ایسے وقت میں یہاں کیسے؟

آپ کے سامنے اُس وقت ابن خطاب نہیں تھا۔ تین دن پہلے جو آپ نے دعا مانگی تھی، اس کی قبولیت مجسّم پیکر میں سامنے تھی۔ ابن خطاب نے کہا کہ

یہ گواہی دینے کے لئے کہ آپ خدا کے سچے رسولؐ ہیں۔

اس پر حضورؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر میرے لئے ثبات و استقامت کی دعا مانگی۔ عمرؓ اسلام لے آیا اور اس کی حیثیت تو یہ تھی۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد — حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد
آرزو بیخبر از خویش بآغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شُد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شُد

یہ ہے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کا وہ واقعہ جسے انہوں نے خود بیان فرمایا —— وہ واقعہ جس سے مقناطیس اور فولاد کا غیر مرئی اور غیر محسوس رشتہ نگاہوں کے سامنے آجاتا اور اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ مقناطیس کی طرف کھنچ کر جانے کے لئے فولاد بننا ضروری ہے۔ یا، یوں کہئے کہ مقناطیس، فولاد کو اپنے آغوش میں لیتا ہے، مٹی کے ڈھیلے کو نہیں۔ وہ پکار کر کہتا ہے کہ ؎

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری — میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

ابن خطابؓ شراب کی تلاش میں بھٹکا پھر رہا تھا۔ میکدۂ ایقان سے اسے ایسا جرعۂ جہاں تاب نصیب ہو گیا جس نے حقیقتوں پر پڑے ہوئے سب پردے اٹھا دیئے، اور وہ ابن خطاب سے فاروقِ اعظمؓ بن گیا۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دُنیا بدل گئی

اوّلیں خطبات

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد آپ نے جو دو خطبات ارشاد فرمائے وہ اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم اور مستحکم ہوتا ہے ان کے پیش نظر مقاصد کیا ہوتے ہیں اور ان کے عزائم کیا۔ آپ نے خطبۂ اوّل میں ارشاد فرمایا۔

حضرت عمرؓ کا پہلا خطبہ

لوگو! میں تمہیں میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہؐ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔

آپ نے یہ الفاظ ایسے خلوص اور انکساری کے ساتھ کہے کہ سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت ابو بکرؓ صدیق نے جو کہا تھا کہ خلافت کی ذمہ داریاں (حضرت) عمرؓ کی سختی کو نرمی سے بدل دیں گی، وہ درست تھا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگو! میں خدا سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین کہو۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا :-

بارالٰہا! میں سخت ہوں۔ مجھے حق کی موافقت، اپنی رضا طلبی اور احساس آخرت کے لئے نرم کر دے۔

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا، تو آپ نے دوسری دعا مانگی کہ

یا اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے قوی بنا دے تاکہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پہ دست درازی کرنے لگ جاؤں۔

آپ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پہ سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کہا۔ تو آپ نے بدرگاہ رب العزت عرض کیا کہ

یا اللہ! میں بخیل ہوں۔ مجھے امور خیر کے لئے سخی بنا دے۔ لیکن اس سخاوت میں ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔

مجمع پہ سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد آپ نے فرمایا :-

ایہا الناس! اللہ نے میرے دور رفقاء کے بعد مجھے تم میں باقی رکھا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میں اسے کسی دوسرے پہ نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہو گا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہو گی تو اس کے لئے میں حتی الامکان ایسے لوگوں کو متعین کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پہ چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں گا۔ اگر غلط روش اختیار کریں گے تو انہیں عبرت ناک سزا دوں گا۔

اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا کہ

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہو گی۔ اور اسی پہ عمل کرو تاکہ تم حامل قرآن ہو جاؤ۔ اپنے نفوس کا وزن کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا وزن کیا جائے۔ قیامت کے دن کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس کے بعد پھر اپنے لئے ایک اور دُعا مانگی جس میں کہا کہ

بارالٰہا! مجھے تفکر و تدبر قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اُسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پہ غور کر سکوں۔

یا اللہ! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پہ عمل پیرا رہوں۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

یہ مختصر خطبہ تھا۔ دوسرے، قدرے مفصل خطبہ میں آپ نے حمد و ثنا کے بعد برسر منبر فرمایا :-

مفصل خطبہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ میری سختی سے خائف اور میری درشتی سے لرزاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمرؓ اس وقت بھی ہم پہ سختی کرتا تھا جب ہم رسول اللہ کے سایۂ عاطفت میں تھے اور اس وقت بھی جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت صدیق اکبرؓ حائل تھے۔ لیکن اب کیا ہو گا جب ہم میں نہ رسول اللہ موجود ہیں نہ ابوبکر صدیقؓ۔ اور معاملات تمام کے تمام اس کے ہاتھ میں ہیں۔

جو شخص بھی یہ کہتا ہے وہ ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتا ہے کہ مجھے رسول اللہ کی مصاحبت کا شرف حاصل تھا اور میں ان کا فرماں پذیر تھا۔ وہ سراپا نرمی اور رحمت تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ وہ مؤمنین کے لئے راحت اور رحمت کا سرچشمہ ہیں۔ بارگاہِ رسالتؐ میں میری حیثیت ایک شمشیر برہنہ کی سی تھی۔ جب حضورؐ چاہتے اس شمشیر کو اذنِ کار عطا کر دیتے اور جب چاہتے اسے نیام میں رکھ لیتے۔ میں حضورؐ کی خدمت میں اسی طرح رہا تاآنکہ اللہ تعالیٰ کو یاد فرما لیا۔ حضورؐ آخر وقت تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور اس سعادتِ عظمیٰ پر مجھے فخر و ناز ہے۔

اس کے بعد اُمت کی زمام کار حضرت ابوبکرؓ صدیق کے سپرد کر دی گئی جن کے تحمل اور نرمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان کا بھی خادم اور مددگار تھا اور اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمو دیتا تھا۔ میں حسب سابق ایک برہنہ تلوار تھا جسے وہ جس وقت چاہتے بروئے کار لاتے، اور جب چاہتے زیرِ نیام کر لیتے۔ میں اسی طرح ان کے ساتھ رہا یہاں تک کہ خدا نے انہیں ہم سے جُدا کر دیا۔ وہ بھی آخر دم تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں۔ اور یہ سعادت میرے لئے وجہِ مسرت ہے۔

اور اب کہ، اے لوگو! تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میری وہ سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔ رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأتِ ایمانی رکھتے ہیں، تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرے گا تو میں اُسے اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں تاآنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن اس تمام سختی کے باوجود، میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ اور تم پر میرا صرف یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور مالِ غنیمت میں سے جو اللہ تمہیں عطا کرے (یعنی مملکت کی آمدنی میں سے) اپنے کفاف کے لئے لوں، لیکن اسے ناحق نہ لوں۔ تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہارے عطیات اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں۔

اور یہ حق بھی کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ تمہیں بلاضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں۔ اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہ پرداخت کروں۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! میرا ہاتھ بٹاؤ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں میری مدد کرو۔ تمہاری جو خدمات اللہ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔ میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں۔ میں یوم الحساب

کا منتظر ہوں۔ جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اسے کیسے خرچ کیا۔
یہ تھا مملکتِ اسلامیہ کا وہ منشور جس سے عہدِ فاروقی کا آغاز ہوا۔

سربراہِ مملکت کا وظیفہ

منصبِ خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مملکت کے مال و دولت میں سربراہِ مملکت کا حصّہ کس قدر ہونا چاہیئے۔ یہ سوال سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا کہ معلوم کرو کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم روزانہ اجرت کیا ہے وہی اُجرت آپ نے اپنے لئے بطورِ وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے ایک نے کہا کہ اتنے کم روزینے میں آپ کا گزارہ کس طرح ہوگا، تو آپ نے فرمایا کہ اُسی طرح جس طرح اس میں اس مزدور کا گذارہ ہوتا ہے۔ اور اگر گذارہ نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اُجرت بڑھا دوں گا تاکہ اس طرح خود میرا وظیفہ بڑھ جائے۔ میرا معیارِ زیست مزدور سے بلند نہیں ہونا چاہیئے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے لئے جو وظیفہ مقرر کیا وہ یہ تھا:۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال۔ ان کپڑوں کا اور اس خوراک کا انداز کیا تھا، اس کی بابت آگے چل کر بات ہوگی۔

تین خطرناک گھاٹیاں

تاریخِ انسانیت میں تین ایسی خطرناک گھاٹیاں آتی ہیں جہاں سے پھسلنے کے بعد قومیں سیدھی جہنم میں جا گرتی ہیں۔ فرعون یعنی ملوکیت۔ ہامان یعنی مذہبی پیشوائیت اور قارون یعنی رزق کا مسئلہ۔ خلافت میں ملوکیت تو خود بخود جڑ سے کٹ جاتی ہے۔ باقی دو گھاٹیوں کے متعلق حضرت عمرؓ نے قوم کو ابتداء ہی سے ان خطرات سے آگاہ کر دیا۔ رزق کے متعلق کہا:۔

اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب و جستجو سے فارغ ہو کر نہ بیٹھ جائے اور یہ کہتا رہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے کوئی مُن نہیں برستا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے تمام انسانوں کے رزق کی جو ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے وہ اسے براہِ راست پوری نہیں کرتا۔ وہ اسلامی نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ پیدائشِ رزق کے متعلق آپ نے فرمایا کہ متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر خدا کے قانون پر بھروسہ کرتا ہے۔

قرآن کافی ہے

جہاں تک مذہبی پیشوائیت کا تعلق ہے ایک شخص ایک دفعہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امیر المؤمنین جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی، اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا:۔

یاد رکھو تم سے پہلی اُمتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے یہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔

فاروقی نگاہ اسے کہتے ہیں۔ حسبنا کتاب اللہ آپ ہی کا ارشاد تھا۔

حاکم و محکوم کا تعلق

تاریخ انسانیت میں وہ مشکل ترین مسئلہ جس کا اطمینان بخش حل آج تک دریافت نہیں ہو سکا یہ ہے کہ حاکم اور محکوم کے تعلقات کس قسم کے ہونے چاہئیں۔ اسلام میں حاکم اور محکوم کی تفریق اور تمیز تو باقی نہیں رہتی کیونکہ اس میں کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں بھی ایسے ارباب حل و عقد تو بہرحال ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں معاشرہ کا نظم و نسق سرانجام پاتا ہے۔ اسلامی نظام میں ان ارباب نظم و نسق کی پوزیشن کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق حضرت عمرؓ فاروق کے بکثرت ارشادات تاریخ میں منقول ہیں۔ میں ان میں سے دو چار مثالاً پیشِ خدمت کرتا ہوں۔ انہوں نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام اپنے مکتوب میں ایک فقرہ ایسا لکھا جس میں فلسفۂ سیاست و اخلاق کی ساری تفصیل سمٹ کر آگئی ہے۔ آپ نے لکھا:-

اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیا سمجھتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے یہاں تمہارا مرتبہ وہی ہے جو مخلوق کے یہاں ہے۔

حضرت عمروؓ بن عاص کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ:

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعایا ہو تو تم چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہونا چاہیئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کے بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

ان ہی کے نام ایک اور خط میں لکھا:-

یاد رکھو! جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے اس کی رعایا بدبخت ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا:-

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں۔ اور جس میں سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں —— بلا ضعف نرمی اور بلا جبر قوت یہ ہے اصل الاصول۔

ایک خطبے میں فرمایا:-

جو شر پیدا کر کے غالب آیا وہ غالب نہیں مغلوب ہے جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔ جس میں تکبر ہو تو سمجھ لو کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہے۔

جو امور سلطنت کے لئے خطرناک ہوتے ہیں ان میں آپ نے ایک ایسا اصول بیان کیا کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے۔ فرمایا:-

طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار، دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ بن سعد نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا :-

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں، بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔ حضرت عمرؓ نے سُنا تو فرمایا کہ عمیر میرے قریب ہوتے تو ان کے مشوروں سے کس قدر مستفید ہوتا!

آپ نے ایک دفعہ حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کو ایک تفصیلی مراسلہ بھیجا جس میں بعض بنیادی ہدایات درج تھیں۔ وہ ایسا اہم ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اُسے سارے کا سارا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ غور سے سُنیئے۔ فرمایا :-

جب بھی کبھی دو ایسے معاملات سامنے آئیں جن میں ایک "اللہ کے لئے" ہو اور دوسرا دُنیا (کے طبیعی مفاد) کے لئے۔ تو دُنیا سے متعلق حصّہ پر اللہ سے متعلق حصّہ کو ترجیح دو (یعنی دنیاوی مفاد کو ہمیشہ مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع رکھو)۔ اگر کبھی قبائلی تنازعہ ابھرے اور کوئی شخص "یا آلِ فلاں" کہہ کر آواز دے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی آواز ہے۔ ایسا کہنے والوں کی تلوار سے خبر لو، تاآنکہ وہ اللہ اور اپنے امام کی طرف رجوع کر لیں۔ مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ قبیلہ ضبّہ کے بعض افراد نے "یا آلِ ضبّہ" کہہ کر پکارا ہے۔ (اگر یہ سچ ہے تو) میرا مراسلہ پہنچتے ہی انہیں سخت سزا دو تاکہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔

قبائلی عصبیت

آپ نے غور فرمایا، عزیزانِ من! کہ اسلام میں قبائلی تفریق کس قدر سنگین جرم قرار پاتی ہے۔ بہرحال، آپ نے اپنے مکتوب میں لکھا

جہاں تک تمہاری ذات کا تعلق ہے تم سب کے لئے اپنے دروازے یکساں طور پر کھلے رکھو۔ ان کے کام خود سرانجام دو۔ مریضوں کی عیادت کرو۔ ان کے جنازوں میں شرکت کرو کیونکہ تم ان ہی میں کے ایک فرد ہو، اس فرق کے ساتھ کہ اللہ نے تم پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے ایسا کپڑا پہنتے، ایسا کھانا کھاتے اور ایسی سواریاں رکھتے ہیں، جو عام مسلمانوں کو میسّر نہیں۔ خدا کے بندے! کہیں تیرا حال اس جانور کا سا نہ ہو جائے جس کا گذر ایک شاداب وادی پر ہوا تو سوائے چرنے اور فربہی کے اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہیں رہا، حالانکہ وہی چرنے اور فربہی اس کی ہلاکت کا موجب تھی۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ حاکم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جب حاکم بگڑتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے اس کی رعیت بدبخت ہو جائے۔

یہ تھا حضرت عمرؓ کی احتیاط کا عالم، اور اس قسم کی تھیں ان کی ہدایات جو وہ ذمہ دار اربابِ مملکت، اور سپہ سالارانِ جیوش و عساکر کو بھیجتے رہتے تھے۔

قابلِ اعتماد کون ہوتا ہے

اکثر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قابلِ اعتماد کس شخص کو سمجھا جائے۔ اس باب میں آپ نے ایسا معیار بیان فرمایا ہے کہ اس سے یہ اہم سوال نہایت عمدگی سے حل

ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو قابلِ اعتماد ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا :-

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے ؟ ——— اس نے کہا نہیں۔

پھر پوچھا : کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو ؟ ——— اس نے کہا نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا : کہ کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے۔

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں تو آپ نے فرمایا پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا ہو گا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔

غور کیجئے کہ کسی شخص کے ثقہ اور قابلِ اعتماد ہونے کے لئے آپؓ نے کیا معیار قرار دیا ہے۔

اور آپؓ کا یہ قول تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کسی شخص نے کہا کہ مؤمن کسی کو دھوکہ نہیں دیتا آپ نے کہا کہ بات پوری کہو "مؤمن نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے"۔

دیانت و امانت

اب آیئے دیانت کی طرف۔ آپؓ سے کسی نے پوچھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ خلیفہ سے پوچھا جائے گا "کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا" اگر وہ خدا کو اس کا اطمینان بخش جواب دے سکا تو خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔ اور یہ درحقیقت تفسیر تھی حضور نبی اکرمؐ کے اس ارشادِ گرامی کی کہ

سربراہِ مملکت کی حیثیت ایک خزانچی کی ہوتی ہے اس کے پاس ڈھیروں مال جمع رہتا ہے لیکن سب اس لئے کہ جہاں تقسیم کرنے کا اُسے حکم دیا جائے وہاں تقسیم کر دے۔

اس معاملے میں حضرت عمرؓ کی احتیاط کی شدت کا کیا عالم تھا، اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں اس باب میں ایک ایسی مثال پیش کرنے پر اکتفاء کروں گا جو بظاہر اتنی چھوٹی ہے جیسے آنکھ کا تل لیکن اس میں تفصیلات کا تاروں بھرا آسمان سمویا ہوا ہے۔ ایک دن بیت المال کا خزانچی جھاڑو دینے لگا تو کوڑے میں سے ایک درہم ہاتھ لگا (درہم اس زمانے کا چھوٹے سے چھوٹا سکہ تھا) اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ اس نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ امیر المؤمنین کا بُلاوا آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ میرے بھائی! میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلا لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن، جب اُمتِ محمدیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

ایک درہم

سربراہِ مملکت کی اس دیانت کا نتیجہ تھا کہ مملکت کے چھوٹے سے چھوٹے اہل کار بھی اسی طرح کے امین اور دیانتدار بن گئے تھے۔ جب مسلمانوں نے ایلان فتح کیا ہے تو وہاں سے اس قدر مالِ غنیمت حاصل ہوا جس کا تصور تک بھی کبھی عربوں نے نہیں کیا تھا ——— کروڑوں نہیں اربوں درہم و دینار۔ جواہرات اور نوادرات کے ڈھیر۔ زرکار فرنیچر و ملبوسات وغیرہ۔ حضرت سعدؓ نے جب

مدائن کا مالِ غنیمت

یہ مال و دولت دارالخلافہ میں بھیجا تو اس کے ساتھ امیرالمؤمنین کو خط بھی لکھا جس میں کہا کہ اس مال و دولت کو دیکھ کر یقیناً آپ کو خوشی ہوگی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات سے ہوگی جو میں اب لکھ رہا ہوں۔ یہ تمام زرد جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہ رکھی سب کچھ لاکر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے اور کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال کہاں مل سکتی ہے؟ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے انہوں نے کہا کہ امیرالمؤمنین آپ کو معلوم ہے کہ سپاہیوں کی اس دیانت کا راز کیا ہے؟ راز یہ ہے کہ

چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاکدامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو رعایا کی نیت میں بھی فرق آجاتا۔

عُمّال کی روشِ زندگی کا اثر

عُمّالِ حکومت کے اخلاق و کردار تو ایک طرف، ان کی عام روشِ زندگی کا اثر عوام پر کس قدر پڑتا ہے اور اس کی اہمیت کا آپ کو کس قدر احساس تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ حضرت طلحہؓ طواف میں رنگا ہوا کپڑا پہنے تھے۔ آپ نے کہا کہ طلحہ! طواف میں رنگدار کپڑا، چہ معنے دارد؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو مٹی کا رنگ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ طلحہ! دوسرے لوگوں کی نسبت آپ حضرات کو زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کے امام (لیڈر) ہیں جن کی اقتدا عوام کرتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل آدمی آپ کو دیکھے گا تو وہ اپنے لوگوں سے کہے گا کہ میں نے حضرت طلحہؓ کو بحالت طواف رنگ دار کپڑا پہنے دیکھا تھا۔ یوں تمہارا معصوم سا عمل لوگوں کے لئے سند بن جائے گا۔ لہٰذا، ہم لوگوں کو بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔

رزق کی ذمّہ داری

پہلے (اور متعدد بار) بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائے۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشادِ گرامی بھی زبان زد خلائق ہے کہ

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

عوام کی ضروریات کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لئے آپ کس حد تک آگے چلے جاتے تھے اس کے متعلق آپ اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ جب آپ کے زمانے میں قحط پڑا تو آپ نے اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کر لی کہ جب تک قحط رہے گا وہ سالن کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ صرف زیتون کے تیل کے ساتھ سوکھی روٹی کھائیں گے۔ اس سے آپ کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی اور آپ دن بدن لاغر ہوتے چلے گئے۔ اس پر آپ کے رفقاء کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ اس تبدیلیٔ غذا کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے آپ اپنے معمول کی غذا کی طرف پلٹ آئیے۔ اس کے جواب میں آپ نے وہ فقرہ کہا کہ اگر دنیا کے سربراہانِ مملکت اسے اپنی زندگی کا اصول بنالیں تو یہ جہنم آج ہی مبدل بہ فردوس ہو جائے۔ آپ نے فرمایا:-

مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گزرے جو ان پر گزرتی ہے۔
اس قسم کے سربراہانِ مملکت کی موجودگی میں رعایا کو سر بفلک ایوانِ شاہی کی طرف سر اٹھا کر بصد حسرت و یاس یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ

تمہیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اترے ہو بام سے!

وہ سربراہِ مملکت خاکساروں کے حالات براہِ راست معلوم کرنے کے لئے راتوں کی تنہائیوں میں ـــــ جب سارا عالم سوتا تھا ـــــ شہر کا گشت لگاتے تھے۔ اسی گشت کے دوران انہوں نے ایک رات دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ آپ نے اس

حاکم کی ذمہ داری

عورت سے کہا کہ کیا تم نے امیر المؤمنین کو اس کی اطلاع دی ہے؟ اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس دور میں عام عورتیں بھی حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر رہے اس تک شکایات پہنچانے سے کیا حاصل۔

حضرت عمرؓ خاموشی سے پلٹ آئے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اپنے معاون اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلم! اب اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہو گیا ہے اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھانے دو۔ یہ سامان لا کر اس عورت کو دیا۔ اس نے ہنڈیا چڑھائی تو آپ چولہا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ امیر المؤمنین ہونے کے قابل تم تھے، نہ کہ عمرؓ۔

فی الحقیقت امیر المؤمنین ہونے کے قابل یہی تھے۔

افرادِ معاشرہ کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری اس طرح ادا نہیں ہوتی تھی کہ سربراہِ مملکت تو مرغ اور بریانی کھائے اور رعایا

جو کی روٹی

کو دال روٹی ملے۔ وہاں کیفیت یہ تھی کہ کوفہ کا عامل عتبہ بن فرقدؓ ملاقات کے لئے آیا تو امیر المؤمنین کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جَو کی روٹی تھی۔ اس مہمان نے کہا کہ امیر المؤمنین آپ جَو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں۔ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ اس پر آپ نے کہا:۔

ابن فرقدؓ! کیا سرزمینِ عرب میں اس وقت مجھ سے زیادہ صاحبِ مقدرت کوئی ہے؟

اس نے جواب میں کہا کہ کوئی نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس مقدرت کے باوجود میں جو گیہوں کے بجائے جَو کی روٹی کھاتا ہوں تو اس کی وجہ عدمِ استطاعت نہیں۔ کچھ اور ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اس نے کہا کہ میں ایسا تو نہیں کہہ سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جَو کی روٹی میسر آ رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جس دن اسے اس کا اطمینان ہو جائے کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

آج کل ملک میں اسلام کے معاشی قوانین اور اسلامی سزاؤں کے متعلق بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس اہم حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ یہ قوانین اور یہ سزائیں اس مملکت کے لئے ہیں جس میں اسلامی نظام رائج ہو۔ اسلامی نظام کی ایک شق یہ بھی ہے کہ اس میں ہر فردِ معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوتی ہے۔ اگر مملکت اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برا نہ ہو تو اس میں نہ معاشی قوانین نافذ ہوتے ہیں اور نہ اس قسم کی سزائیں مل سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں حاطب بن ابی بلتعہؓ کے ملازموں کا واقعہ اہم نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ چوری کیوں کی؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے کام تو سخت لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

اسلامی سزائیں

یہ سن کر آپ نے ان ملازموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا تمہیں دی جائے اس لئے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے ملازم نہیں تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر تمہارے ملازموں کی پھر یہی حالت ہو گئی تو تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

اس ایک واقعہ سے جرم و سزا کے متعلق جو عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے، اس سے کس قدر پیچیدگیاں حل ہو جاتی ہیں۔

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بھی تھا کہ حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت واجب آتی ہے جب متعلقہ شخص حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو چکا ہو۔ اس ضمن میں ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں اپنی آزادی حاصل ہونے کے بعد حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

حکومت کے واجبات

پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لے کر آنا۔

اور رفاہِ عامہ کے ضمن میں جو کچھ رعایا پر خرچ کیا جاتا تھا حکومت اس کے بدلے میں شکریہ تک کی بھی متمنی نہیں ہوتی تھی۔ جس قحط کا پہلے ذکر آ چکا ہے اس کے رفع ہو جانے کے بعد جب قبائل واپس جانے لگے تو بنی محارب کے ایک شخص نے آپ سے کہا کہ یہ قبائل آپ کے بیحد ممنونِ احسان اور شکر گزار ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا :-

شکریہ تک بھی نہیں

بھئی! تم نے ایسا کیوں کہا۔ جو کچھ میں نے آپ لوگوں پر خرچ کیا ہے بلال (میرا یا میرے باپ خطاب کا نہیں تھا۔ یہ اللہ کا مال تھا جسے میں نے اللہ کے بندوں پر خرچ کر دیا۔ اس لئے میری شکر گزاری کیسی؟

اہلِ خانہ کو ہدایات

حضرت عمرؓ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ عمالِ حکومت کتنے ہی دیانتدار کیوں نہ ہو جب

تک ان کے اہلِ خاندان ان کے ساتھ تعاون نہ کریں، ان کی دیانتداری کا قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں بات سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہے حدود سے تجاوز کرے۔ جو چاہے ان کے اندر رہے۔

ایک دفعہ آپؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ اور عبید اللہؓ جہاد سے واپس مدینہ آ رہے تھے۔ راستے میں بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے انہیں کچھ روپیہ دیا کہ اسے جا کر بیت المال میں جمع کرا دیا جائے۔ انہوں نے گورنر سے کہا کہ انہیں اس کی اجازت ہے کہ وہ راستے میں اس روپیہ سے کچھ کاروبار کر لیں۔ اصل روپیہ بیت المال میں داخل کر دیں اور منافع خود رکھ لیں۔ گورنر نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

بیتُ المال کا روپیہ

حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے . . . بیٹوں سے پوچھا کہ کیا گورنر نے اس کی اجازت تمہیں ہی دی تھی یا اور لوگوں کو بھی۔ انہوں نے کہا کہ اس نے یہ اجازت ہمیں ہی دی تھی۔ آپ نے کہا کہ اس نے تمہیں یہ اجازت اس لئے دی تھی کہ تم امیر المومنین کے بیٹے ہو۔ تمہیں اس کا منافع بھی بیت المال میں داخل کرنا ہو گا۔

ایک دفعہ آپ کو کوفہ کی گورنری کیلئے کسی موزوں شخص کا انتخاب کرنا تھا اور اس میں آپ کو کچھ دشواری پیش آ رہی تھی۔ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ میں آپ کو ایسا شخص بتاتا ہوں جو اس منصب کے لئے نہایت موزوں ہے۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا عبداللہؓ ابنِ عمرؓ۔ یہ سن کر آپ نے اُس سے کہا کہ میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ خدا تمہیں غارت کرے۔ اس باب میں آپ کی نگاہ کس حد تک دور چلی جاتی تھی اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آپ کا معمول تھا کہ کوئی پھل یا کھانے پینے کی کوئی اور اچھی چیزیں آتیں تو انہیں حصہ رسدی امہاتُ المؤمنین کو تحفتاً بھیجتے۔ حضرۃ حفصہؓ ام المؤمنین بھی تھیں لیکن اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی۔ آپؓ امہاتُ المؤمنین کے حصے لگاتے وقت حضرت حفصہؓ کا حصہ سب سے آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کمی رہ جائے تو وہ اُن کے حصے میں ہو۔

کوفہ کی گورنری

حضرت حفصہؓ

رشتے دار تو ایک طرف۔ جب ایک شخص سے حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں تمہیں عزیز رکھتا ہوں تو اس نے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ مجھے حکومت کی طرف سے جو مراعات اس وقت حاصل ہیں آپ ان میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میرے حال پہ کرم کیجئے۔ مجھے اپنے اسی مقام پر رہنے دیجئے اپنا عزیز نہ بنایئے۔

دوست

عزیزانِ من! میں کہاں تک ان داستانوں کو پیش کرتا جاؤں — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے — پھر وقت کا تقاضا بھی بار بار میرا دامن کھینچ رہا ہے لیکن اس حکایت روح پرور کو ختم کرنے سے پہلے میں اس کے دو ایک نرم و نازک گوشوں کو سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پہ حضرت عمرؓ کا نقشہ کچھ اس قسم کا سامنے لایا جاتا ہے کہ آپ بڑے درشت مزاج، جابر و باسر، عبوساً قمطریراً قسم کے انسان

شگفتہ مزاجی

تھے جن کے ہاتھ میں ہر وقت دُرّہ (معاذ اللہ) منہ میں جھاگ، آنکھوں میں شعلے اور ماتھے پر شکن رہتے تھے۔ زندگی کے دل گداز اور نرم و نازک گوشوں سے کبھی ان کا گذر نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ان کی یہ تصویر ناقص بھی ہے اور نامکمل بھی۔ ان کی صحیح تصویر اس مردِ مؤمن کی سی ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ او دلِ دردآشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

رقیق القلب

آپ نے ایک دفعہ ایک شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھوا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا اور آپ کی گود میں بیٹھ گیا۔ آپ نے اسے پیار کیا۔ اس منتخب شدہ شخص نے کہا کہ امیرالمؤمنین! میرے دس بچے ہیں مگر کوئی بھی میرے پاس پھٹک تک نہیں سکتا۔ آپ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور! اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں کیا کروں؟ اس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ پروانہ پھاڑ دو۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آسکتا وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا؟

انسان کو گھر میں کیسے رہنا چاہیئے اس کے متعلق آپ کا ایک حسین سا ارشاد سُن لیجئے اور اگر اللہ توفیق دے تو اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے گھر کو جنت بنا لیجئے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ

انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آئے تو مرد بن جائے۔

ذوقِ جمالیات

آپ کا شعر کا ذوق نہایت بلند تھا اور موسیقی کا مذاق بڑا شستہ اور پاکیزہ۔ زندگی کے جمالیاتی پہلو کے سلسلہ میں آپ کی لطیف حسیات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ آپ نے ایک زاہد مرتاض کو دیکھا جس نے دُنیا کی ہر نعمت کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا۔ اسے سختی سے ڈانٹا اور کہا۔

خدا تجھے غارت کرے۔ ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے؟

عزیزانِ من! ان الفاظ کو دہرائیے کہ ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے اور پھر غور کیجئے کہ اسلام کے کتنے نرم و نازک اور تابدار پہلو ان میں مضمر دکھائی دیتے ہیں؟ ایک شخص کو آپ نے دیکھا کہ اس نے بے ہنگم طریق سے اپنی ڈاڑھی بڑھا رکھی ہے۔ آپ نے اسے اپنی طرف کھینچا اور کہا اس بدہیئتی کے کیا معنے؟ پھر آپ نے قینچی منگائی۔ اس کی وضع قطع درست کی اور فرمایا:-

بعض لوگ اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے ہیں گویا وہ درندوں میں سے ایک درندہ ہیں۔

آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ ان کے مزاج میں شگفتگی بھی تھی جو کبھی کبھی ہلکے سے کیف آور مزاح کے رنگ میں جھلک پڑتی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے ایک بدو کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور اس کے بعد دعا مانگی کہ یا اللہ! میری شادی کسی بڑی خوبصورت حور سے کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ اسے دیکھو! مہر کتنا کم باندھتا ہے اور بیوی کیسی بلند پایہ مانگتا ہے؟

جس شخص کی طبیعت میں ایسی ملیح ظرافت ہو وہ خشک مزاج کیسے ہو سکتا ہے۔ مؤمن خشک مزاج ہوتا ہی نہیں۔ وہ تو ——— عجم کے حسنِ طبیعت عرب کے سوز دروں ——— کا دلآویز امتزاج ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ذوقِ لطیف

کو فنڈ کی زندگی پر غالب نہیں آنے دیتا۔

احترامِ آدمیت

اور مقطع کا بند وہ جوہرِ خالص جو اسلامی مملکت ہی نہیں خود اسلام کا نقطۂ ماسکہ اور معراجِ کبریٰ ہے۔ یعنی احترامِ آدمیت۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور اس احترامِ آدمیت کی جھلک اُس جنت بداماں دور میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ بن عاص نے کسی شخص کو منافق کہہ دیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ اس کی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ جاؤ اور اس شخص سے معافی مانگ کر اُسے راضی کر لو۔ یاد رکھو ! بارگاہِ خداوندی میں تذلیلِ انسانیت سے زیادہ سنگین جرم کوئی نہیں۔

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ حمص کے حاکم حضرت عمیرؓ بن سعد (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) کے منہ سے کسی ذمی (غیر مسلم) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے۔ اخذاک اللہ۔ خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں بعد میں

اخذاک اللہ

اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر استعفا دے دیا اور کہا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ جو شخص تکریمِ آدمیت کی عظمت و اہمیت کو نہیں سمجھتا ہے وہ اسلامی نظام میں کسی بھی منصب کا اہل نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کی بلندیٔ اخلاق۔ پاکیزگیٔ سیرت اور ذمے داری کے احساس کا جذبۂ محرکہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے احساس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا جسے مؤاخذۂ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے آخری وقت میں اس احساس

مؤاخذۂ آخرت کا احساس

سے ان کے کرب و اضطراب کا یہ عالم تھا کہ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے کاش ! ابنِ عمر ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا۔ پھر اُن رفقاء کو مخاطب کر کے جو ان کے محاسن کو گنا گنا کر ان کی تعریف کرتے تھے فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستا رہا ہے کہ

> اگر عمرؓ نے کسی پر ظلم کیا ہوگا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہو گی تو اس کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔

آخری وقت فرمایا ! "افسوس اگر اللہ نے میری لغزشوں سے درگزر نہ فرمایا تو میرا انجام کیا ہوگا" ان الفاظ کے ساتھ ہی اپنی وہ جانِ کہ جسے ایمان لانے کے ساتھ ہی اللہ کے ہاتھوں بیچ دیا تھا اس کے حقیقی مالک کے سپرد کر دی۔ اور آپ کی وصیت کے مطابق ایک مزدور (حضرت صہیبؓ رومی) نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ

تدفین

کی دلی خواہش تھی کہ آپ حضور نبی اکرمؐ اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کے ہم پہلو، حجرۂ حضرت عائشہؓ میں دفن ہوں۔ آپ سربراہِ مملکت تھے اس لئے آپ کی اس خواہش کے راستے میں کون حائل ہو سکتا تھا؟ لیکن وہاں تو کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ آپؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ سے کہا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ

عمرؓ آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے ——— دیکھنا! امیرالمومنین عمرؓ نہ کہنا۔ صرف عمرؓ کہنا۔ اور عرض کرنا کہ وہ مستدعی ہے کہ آپ انہیں پہلوئے حضور رسالتمآبؐ میں دفن ہونے کی اجازت مرحمت فرماویں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ وہ جگہ میں نے اپنے لئے مختص کر رکھی تھی لیکن میں عمرؓ کو اپنے پر ترجیح دیتی ہوں۔ بیٹے نے آپ کو آ کر حضرت عائشہؓ کا پیغام سنایا تو آپ خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ جب میں وفات پا جاؤں تو ایسا کرنا کہ میرا جنازہ لے جانا اور حضرت عائشہؓ سے ایک بار پھر اجازت طلب کرنا۔ ممکن ہے انہوں نے اس وقت میری خاطر ایسا کہہ دیا ہو۔ اگر وہ میری وفات کے بعد بھی اس کی اجازت دے دیں تو مجھے وہاں دفن کرنا، ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔

یہ تھے وہ حضرات جن کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم اور مستحکم ہوا تھا۔

مصر کے نامور مفکر ڈاکٹر طہٰ حسینؒ نے بارگاہ فاروقی میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

خراجِ عقیدت

میں نہیں جانتا کہ تاریخ انسانی کسی ایسے شخص کی مثال پیش کر سکے جو حضرت عمرؓ کا سا زندہ، حساس، محتاط اور معصیت سے خائف ضمیر رکھتا ہو۔ جو اپنے حق میں اُن باتوں سے بھی ڈرتا ہو جن میں ڈرنے کی کوئی بات نہ ہو۔ اُن امور سے بھی باز رہتا ہو جن سے باز نہیں رہا جاتا اور اپنی ذات پر ایسی سختیاں کرتا ہو جو صرف ایک اولوالعزم انسان ہی کر سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دُنیا کی متمدن اور ترقی یافتہ قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں جس مقام پر حضرت فاروقؓ اعظم اُس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ متمدن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔ (الفتنۃ الکبریٰ)

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی حضرت عمرؓ کی خدمت میں بڑی تفصیل سے ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کیا گیا ہے۔ میں اس مقام پر اس کا صرف آخری فقرہ پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

عمرؓ کا زمانۂ خلافت بظاہر شخصی حکومت کا دور نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جنون ملوکیت کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ (۱۹۳۴ء ایڈیشن صفحہ ۹۸۳)

آپ کے دل میں شاید یہ خیال گذرے کہ یہ تقریب تو عید میلاد النبیؐ کی تھی لیکن میں نے پیش کیا ہے سیرت عمرؓ اور دورِ فاروقی کو۔

عمرؓ ہی نہیں۔ ایک امّت

لیکن اگر ذرا بنظر تعمق دیکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ درحقیقت انقلاب محمدیؐ ہی کی ایک تابندہ تصویر ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے حضورؐ کا فریضۂ رسالت ایسے انسان پیدا کرنا تھا جو آپؐ کی معیت میں اسلامی نظام کی بنیاد رکھیں اور آپ کے بعد اس کے فروغ اور استحکام کا باعث بنیں۔ میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا کارنامہ اور معجزہ انسانیت سازی ہے۔ آپ نے دنیائے سنگ و خشت ہی میں انقلاب برپا نہیں کیا بلکہ دلوں کی بستیوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ یہ حضورؐ کی انسانیت سازی کا کرشمہ تھا کہ عرب جاہلیت کے "ابن الخطابوں" کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں

ان کی تعظیم میں جہانِ تہذیب و تمدن کے دیدہ وروں کے سر جھکتے ہیں۔ میں نے اسی جہت سے حضرت عمرؓ کو "شاہکارِ رسالت" کہہ کر پکارا ہے ——— یعنی حضور نبی اکرمؐ شاہکارِ خداوندی، اور فاروقِ اعظمؓ شاہکارِ رسالتؐ۔

لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ حضورؐ کی تعلیم و تربیت نے صرف ایک عمرؓ پیدا کیا۔ حضورؐ نے ایک جماعت پیدا کی، ایک امت پیدا کی جس کے افراد کی سیرت اسی قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔ قرآن اس جماعت کو گروہ مؤمنین سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ محض بغرضِ تعارف ہے کہ ہم انہیں صحابہؓ کہہ کر پکارتے ہیں ورنہ وہ سب کے سب مؤمن تھے۔ جس طرح نبی اکرمؐ نے تنہا اس نظام کی بنیاد نہیں رکھی تھی بلکہ جماعتِ مؤمنین آپ کے ساتھ تھی، اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی یہ کارنامے تنہا سرانجام نہیں دیئے تھے۔ جماعتِ مؤمنین کے تعاون اور رفاقت سے سرانجام دیئے تھے۔ اور ان کی سیرت بھی علی قدرِ مراتب انہی صفات کی آئینہ دار تھی۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ فوج کے سپاہیوں تک بھی دیانت و امانت کے اسی مقام پر فائز تھے جس پر حضرت عمرؓ فاروق متمکن نظر آتے ہیں۔ اس سب کا (CREDIT) بالواسطہ حضور رسالتمآبؐ ہی کو پہنچتا ہے۔ یہ سب اسی آفتاب عالمتابؐ کی کرنیں تھیں جو وجۂ تابانیٔ عالم ہو رہی تھیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہمارے ہاں تمام تحقیقاتی کوششیں یہ معلوم کرنے کے لئے صرف ہو رہی ہیں کہ صدرِ اوّل میں اسلامی نظام کی ہیئتِ ترکیبی کیسی تھی، اور اسی کے لئے بحثیں یہ چھڑتی ہیں کہ مروّجہ طریقِ انتخاب

لاحاصل بحثیں

اسلامی ہے یا نہیں۔ اور اسلامی مملکت میں صدارتی نظام ہوگا یا پارلیمانی وغیرہ وغیرہ۔ اور صدرِ اوّل کے نظام سے متعلق تحقیقات یہی کچھ معلوم کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ لیکن اوّل تو اس باب میں متعین طور پر کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ہماری تاریخ اس قدر ناقابلِ اعتماد اور متضاد روایات کا مجموعہ ہے کہ اس کی رو سے حتمی اور یقینی طور پر کسی نتیجے پر بھی پہنچا نہیں جا سکتا۔ میرے نزدیک تو یہ تاریخ مسخ شدہ اور محرّف ہے لیکن جو حضرات اس تاریخ کی رو سے اسلامی نظام کا نقشہ مرتب کرنا چاہتے ہیں، میں ان کی خدمت میں عرض کروں گا کہ آپ اس تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور زیادہ نہیں تو خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب کی جو تصویر اس میں دی گئی ہے اسے دیکھئے اور سوچئے کہ کیا یہ تصویر اسلامی انتخاب کی ہو سکتی ہے؟ اس میں (معاذ اللہ) ایک اُمیدوار کے ہاتھ میں دوسرے کی ڈاڑھی نظر آتی ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں شمشیر! اس سے آگے بڑھیئے اور حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اس کے بعد کے وہ واقعات سامنے لایئے جو یہ تاریخ پیش کرتی ہے۔ جنگِ جمل میں آدھے صحابہؓ ایک طرف دکھائی دیتے ہیں اور آدھے دوسری طرف، اور باہمی خونریزی کا یہ عالم ہے کہ دس ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کی تلوار کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جنگِ صفین کا نقشہ سامنے آتا ہے جس میں ستر ہزار صحابہؓ کام آجاتے ہیں! کیا آپ اسی قسم کا اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اس مسخ شدہ تاریخ نے تو ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیا!

یہ تو رہی تاریخ کی رو سے اس دور کے نظام کی ہیئت وغیرہ کے متعین کرنے کی صورت۔ اگر بفرضِ محال اس

ہمارے دور کے تقاضے

دور کے نظام کی شکل و صورت متعین بھی ہو جائے تو کیا اس شکل و صورت کا نظام ہمارے دور کے تقاضوں کو پورا بھی کر سکے گا! جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اسلامی نظام نام ہے قرآنی اقدار و اصولِ حیات کو عملاً نافذ کرنے کا۔ اس عملی نفاذ کا طریق اُس زمانے میں اور تھا،

اس زمانے میں ہمارے حالات کے تقاضوں کے مطابق اور ہوگا۔ مثلاً، امورِ مملکت کے متعلق قرآن کریم نے یہ اصول دیا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ " امت انہیں باہمی مشاورت سے طے کرے گی "۔ اس مشاورت کا طریق صدرِ اوّل میں کچھ اور تھا، ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کچھ اور ہوگا۔ اس کی وجہ خود حضورؐ نے یہ کہہ کر بیان فرما دی کہ

لوگ اپنے اسلاف کے مقابلے میں اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ (جاحظ ـــــ البیان والتبیین)

امام ابن قیمؒ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

اللہ کی شریعت کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطرق الحکمیہ)

حضرت عمرؓ کے فیصلے

اسی تغیرِ احوال و کوائف کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے کئی معاملات میں ایسے فیصلے کئے جو عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صدیقیؓ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور کئی امور کے لئے نئے قوانین مرتب اور نافذ فرمائے۔ انہیں " اولیاتِ عمرؓ " سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت اور عہدِ رسالت مآبؐ میں چند سالوں کا فرق تھا۔ اگر اُن چند سالوں میں زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ سابقہ احکام و قوانین کی جگہ جدید قوانین مرتب کئے جائیں، تو آج چودہ سو سال کے بعد یہ تقاضے کہیں کے کہیں جا پہنچے ہیں۔ ان کے لئے آج کی اسلامی مملکت کو قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے لامحالہ جدید قوانین مرتب کرنے ہوں گے۔

لہٰذا، سوال اسلامی نظام یا کسی سابقہ دور کے قوانین کا نہیں۔ اصل سوال ان انسانوں کا ہے جنہوں نے اس

سوال انسان سازی کا ہے

نظام کو قائم کرنا ہے۔ ان انسانوں کی خصوصیات جنہیں مؤمن کہا جاتا ہے بڑی تفصیل سے قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اگر ان خصوصیات کو معیار قرار دے کر صدرِ اوّل کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں وہ افراد سامنے آجائیں گے جو ان خصوصیات کے حامل تھے۔ سو بنیادی سوال ایسے انسان پیدا کرنا ہے جو ان خصوصیات کے حامل ہوں۔ ان ہی کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا جس طرح عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صحابہؓ میں قائم ہوا تھا۔

اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب، نبی اکرمؐ تو خدا کے رسول تھے۔ ان جیسا کردار ہم میں کیسے پیدا ہو

اِس کا امکان نہیں

سکتا ہے۔ اور صحابہؓ کا ذکر آئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی وہ تو صحابہؓ تھے۔ ہم بندے بشر اُن جیسے کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ کہہ کر وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنے مخاطب کو بھی خاموش کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں عام لوگ ہی نہیں کرتے۔ اچھے اچھے " عالمِ دین " بھی ان کے ہمنوا ہوتے ہیں۔ مثلاً : ایک دفعہ (مولانا) امین احسن اصلاحی نے اسی قسم کے سوال کے جواب میں کہا تھا :-

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔

(چراغِ راہ۔ بابت مئی ۱۹۵۳ء)

اگر کیفیت یہی ہے تو میں بصد ادب پوچھنا چاہوں گا کہ پھر اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کا یہ ڈھنڈورا کاہے کے لئے پیٹا جاتا ہے؟ پھر چھوڑیئے اس سعی لاحاصل کو۔ اگر یہ ناممکن ہے تو پھر اپنے آپ کو فریب دینے سے کیا حاصل؟ لیکن میرے نزدیک صورت یہ نہیں۔ ذرا سوچیئے کہ اللہ نے نبی اکرمؐ کی سیرت کو نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ، یعنی بہترین ماڈل قرار دیا ہے۔ اگر ہم میں اس قسم کی سیرت و کردار پیدا نہیں ہو سکتا تو پھر حضورؐ کی سیرت ہمارے لئے نمونہ کیسے بن سکتی ہے؟ یاد رکھئے! سلسلۂ نبوت تو حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ سیرتِ رسول اللہؐ کی آئینہ داری ختم نہیں ہوئی۔ وہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے ماڈل ہے۔

جہاں تک صحابہ کرامؓ کا تعلق ہے، وہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) مؤمن تھے اور مؤمنین کا وجود اسی دور تک محدود نہیں تھا۔ اور پھر حضور نبی اکرمؐ نے یہ بھی تو فرمایا تھا کہ

تم پر میری اور میرے صاحب رُشد و ہدایت خلفاء کی سُنت کی پیروی لازم ہے۔

اس اعتبار سے آنے والے تمام زمانوں کے لئے سیرتِ رسول اللہؐ اور سیرت خلفاء راشدینؓ اسوۂ حسنہ قرار پاتی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس سیرت و کردار کے حامل مؤمن قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ بنا بریں جو قوم اسلامی

کرنے کا کام

نظام قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھے اس کے لئے (ارشادِ خداوندی اور سُنتِ نبویؐ کے اتباع میں) کرنے کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ قرآنی تعلیم و تربیت سے مؤمن پیدا کرے جو اس نظام کو قائم کر کے چلا سکیں۔ جب یہ مؤمن پیدا ہو جائیں گے تو وہ قرآنی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس نظام کا طریق کار بھی متعین کر لیں گے اور اسلامی قوانین بھی مرتب کر لیں گے۔ اس کے سوا اسلامی نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اگر ہم یہ نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں اسلامی نظام کے قیام کے دعاوی ترک کر دینے چاہئیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے ناممکن العمل دعاوی سے (یعنی ان دعاوی سے جنہیں ہم عمل میں نہ لا سکیں) اسلام دُنیا میں بدنام ہو جائے گا۔ وہ ہماری وجہ سے پہلے ہی کم بدنام نہیں ہو چکا جو اس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہو! یہی وہ جگر پاش حقیقت تھی جس سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے چھاتی پہ پتھر رکھ کر کہا تھا کہ ؎

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او (پس چہ باید کرد۔ صـ۴۹)

اگر تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم اپنی نئی نسل کی قرآنی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دیتے تو اس وقت تک وہ قوم تیار ہو چکی ہوتی جو اسلامی نظام کے قیام کی اہل ہوتی، لیکن ایسا نہ ہو سکا، اور ہم بھٹکے ہوئے راہیوں کی طرح شبِ تیرہ و تار میں مصروفِ صحرا نوردی ہیں۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

والسلام (دسمبر ۱۹۸۰ء)

پاکستان میں اسلامی قوانین

مدون کرنے کا سوال بڑی اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی بنیاد قرآن اور سنت پہ ہونی چاہیئے۔ سنت کا مسئلہ اختلافی ہے اور آج تک حل نہیں ہو سکا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ قوانین اسی صورت میں مرتب ہو سکیں گے کہ قرآن مجید کو آئین کی بنیاد قرار دیا جائے۔ اس بنا پر ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ قوم کو بتایا جائے کہ قرآنی قوانین کیا ہیں۔ اس فریضہ کو مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے بطریقِ احسن سرانجام دیدیا ہے اور ایک ضابطہ مرتب کر دیا ہے۔ جس کا نام ہے:۔

قرآنی قوانین

اس میں مختلف عنوانات کے تحت وہ تمام قوانین درج کرائے ہیں جن کا تعلق اسلامی مملکت، حکومت اور نظام سے ہو سکتا ہے۔ ہر قانون سے متعلق آیت یا آیات اور ان کا ترجمہ یا مفہوم بھی دیا گیا ہے۔

آپ سوچئے کہ اس سے اسلامی مملکت کا کتنا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کتاب کا:۔

۱۔ مسلمانوں کے ہر گھر میں ہونا ضروری ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ فلاں معاملہ میں قرآن کریم کا قانون کیا ہے۔

۲۔ اس ملک کے ہر جج اور مجسٹریٹ کی میز پر ہونا ضروری ہے۔

۳۔ ملک کے ہر وکیل (ایڈووکیٹ) کی لائبریری میں ہونا ضروری ہے۔

۴۔ لاء کالجز کے نصاب میں داخل کیا جانا ضروری ہے۔ اور

۵۔ ہر لائبریری میں اس کی موجودگی ضروری ہے۔

کتاب اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر، آفسٹ میں چھاپی گئی ہے اور مضبوط مطلا جلد میں محفوظ ہے۔

قیمت فی جلد پچیس ۲۵/- روپے (محصول ڈاک چھ ۶/- روپے)۔

ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور | ملنے کا پتہ | مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

تبویب القرآن

(۱) آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید نے کیا کہا ہے، اور کہاں کہاں کہا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

(۲) اس کتاب میں اس قسم کے قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں، اور ہر عنوان کے تحت اُن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآنِ مجید میں کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے آپ اس کتاب کی وسعت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ مفکرِ قرآن کی قریب چالیس (۴۰) سال کی محنتِ شاقہ کا ماحصل ہے۔

(۳) کتاب بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ عمدہ سفید کاغذ۔ اوفسٹ کی چھپائی۔ تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ تازہ ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اسکی قیمت دو سو پچاس (۲۵۰) روپے اور محصول ڈاک پندرہ (۱۵) روپے ہے۔ چونکہ کتاب مکمل سیٹ ہی میں کارآمد ہو سکتی ہے اس لئے اسکی الگ الگ جلدیں مہیا نہیں کی جاتیں۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب یومِ پیدائش قائدِ اعظمؒ

بے تیغ سپاہی

(پرویز صاحب کا ایک خطاب)

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت!

عہدِ رسالتمآبؐ میں جب مکی مہاجرین کو مدنی زندگی میں پناہ، سکون، اطمینان، تمکن اور قوت و حشمت حاصل ہو گئی تو انہیں ان کی سابقہ زندگی اور بعد کے تغیرِ حالات کی یاد ان الفاظ میں دلائی گئی کہ:

وَاذْكُرُوٓا۟ إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِى ٱلْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ ٱلنَّاسُ فَـَٔاوَىٰكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ وَرَزَقَكُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ـ (۸/۲۶)

مکی زندگی میں تمہاری حالت یہ تھی کہ تم تعداد میں بھی قلیل تھے اور قوت کے اعتبار سے بھی بے حد کمزور تصور کئے جاتے تھے۔ تمہیں ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ مخالفین تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانا دیا جہاں تم اکٹھے رہ سکتے ہو۔ اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت پہنچائی اور زندگی کی خوشگواریاں عطا کر کے سامانِ نشوونما بہم پہنچایا تاکہ تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔

جو کچھ اس آیۂ جلیلہ میں کہا گیا ہے اس میں اور ملتِ پاکستانیہ کی تقسیمِ ہند سے پہلے اور بعد کی زندگی میں بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ میں نے آج اسی آیت کو اپنے خصوصی درس کا موضوع قرار دیا ہے۔ آخر میں میں اس آیت کے سیاق و سباق کی آیات کو پیش کر کے یہ بھی بیان کروں گا کہ ہماری موجودہ حالت کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ پہلے آپ تحریکِ پاکستان کے نمایاں خط و خال ملاحظہ فرمائیے جن میں یہ حقیقت سامنے آئیگی کہ اس تحریک کا مقصد کیا تھا، اس کی مخالفت کیوں ہوئی اور کن لوگوں کی طرف سے ہوئی، اور اس کی مدافعانہ جنگ کس نے لڑی اور کس انداز سے لڑی اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

اقبالؒ کا احسان

علامہ اقبالؒ کا ملّتِ اسلامیہ پر یہ عظیم احسان ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کی اس فراموش کردہ حقیقت کی یاددہانی کرائی کہ مسلمان، رنگ، نسل، زبان، خون، وطن کی نسبتوں سے ماورا، ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک منفرد قوم ہیں، اور یہ کہ اسلام ایک زندہ حقیقت اسی صورت میں بن سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قرآنی اصول و اقدار کے مطابق حکومت قائم کر سکیں۔ وہ ان حقائق کو جستہ جستہ تو یورپ سے اپنی واپسی کے بعد سے پیش کرتے چلے آ رہے تھے، لیکن انہوں نے اسے منضبط شکل میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کیا[1] جس نے اس خطبے کی تمہید کے بعد اسلام کی اساس کو ان الفاظ میں نمایاں کیا:-

> حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی رسول کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعّال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اس نظری بحث کے بعد وہ اس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:-

> ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:-

> تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ مسلم ایشیا

---

[1] اس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ :-

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ :-

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے — عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ :-

پاکستان کا ہیولیٰ

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے .....

مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ :-

اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ :-

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

علامہ اقبالؒ نے اگرچہ اس حقیقت کو متعین طور پر واشگاف الفاظ میں بیان کیا لیکن اپنوں اور بیگانوں (بالخصوص اپنوں) نے ..... ایک شاعر کا خواب سمجھ کر اسے کسی توجہ کا مستحق

نہ سمجھا۔ ہر چند وہ کہتے رہے کہ۔

حقیقت ہے نہیں میرے تخیّل کی یہ خلّاقی

لیکن قوم نے اس کے باوجود اُسے شاعری ہی سمجھا۔ تاآنکہ اس نظریئے کو عملی شکل دینے کے لئے وہ مردِ مجاہد سامنے آیا جسے خود اقبالؒ کی نگاہِ حقیقت بین و دُور رس نے اس مقصد کے لئے تلاش اور منتخب کیا تھا اور جسے بعد میں قوم نے قائدِ اعظمؒ کہہ کر پکارا۔ جب وہ اس تحریک کو لے کر میدان میں آئے تو

مخالفت

ہر ایک نے محسوس کیا کہ اب یہ نظریہ حقیقت بن کر رہے گا۔ اسے ناکام بنانے کے لئے ہر طرف سے مخالفت ہوئی۔ اصولی طور پر ان مخالفین کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ انگریز، ہندو اور خود مسلمان۔ مسلمانوں میں سیاسی لیڈر بھی شامل تھے، اور علماء کرام بھی۔ میں ان تینوں گروہوں کی مخالفت کو قدرے تفصیل سے بیان کروں گا۔ واضح رہے کہ یہ داستان میری شنید نہیں، دید ہے۔ میں دس سال تک فکری حیثیت سے اس جنگ میں خود شریک رہا۔ اور ہر محاذ کو گہری نظروں سے دیکھا اور ان کی طرف سے مخالفت کی مدافعت میں بھرپور کوشش کرتا رہا۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی اور انگریز اور ہندو کے سیاسی مصالح کا تقاضا تھا کہ ہندوستان غیر منقسم رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ان کی سیاسی مصلحتوں کا بھی تقاضا تھا لیکن ان کی بناءِ مخالفت محض سیاسی نہیں تھی۔ اقبالؒ کا پیش کردہ تصوّر اور قائدِ اعظمؒ کا دعویٰ یہ تھا کہ

بناءِ مخالفت

ہم ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں قرآنی اصولوں کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔ انگریز اور ہندو دونوں کو معلوم تھا کہ قرآنی حکومت سے مفہوم کیا ہے اور اس میں ان کے لئے کس قدر شدید خطرات مضمر ہیں۔ انگریز کی سیاست کا مدار استعمار اور نظامِ سرمایہ داری پر تھا اور یہی ہندو کے بھی عزائم تھے۔ قرآنی نظام ان دونوں لعنتوں کے لئے موت کا پیغام تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر یہ نظام کسی مختصر سے خطۂ زمین میں بھی نافذ ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز حیات پرور نتائج کو دیکھ کر دنیا لپک کر اس کی طرف آجائے گی اور وہ زندہ اقوام کی شکل میں باقی نہیں رہ سکیں گے۔ یہ بعینہٖ وہی خطرہ تھا جسے قریش کی نگاہوں نے بھانپا تھا اور جس سے محفوظ رہنے کے لئے ان کی انتہائی کوشش تھی کہ یہ نظام کسی دور دراز خطے میں بھی قائم نہ ہونے پائے۔ اسی لئے انہوں نے ہجرت کے بعد بھی اس قلیل سی جماعت کا پیچھا نہ چھوڑا اور سات آٹھ سال تک مسلسل مصروفِ پیکار رہے تاآنکہ انہیں آخری شکست میں ہمیشہ کے لئے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس حقیقت کی تائید کے لئے

انگریز کی نگاہ

کہ انگریز قرآنی تصوّراتِ حیات کو خوب سمجھتا تھا ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ۱۹۳۵ء میں دِلّی میں پہلے پہل ریڈیو نصب ہوا تو انہیں عیدالاضحیٰ کی تقریب پر تقریر نشر کرنے کے لئے کسی موزوں مقرر کی تلاش

ہوئی - اسلامی حلقے میں میری کافی شہرت تھی - لہٰذا انہوں نے اس مقصد کے لئے میرا نام تجویز کیا۔ لیکن میں سرکاری ملازمت سے منسلک تھا، اس لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا سرکاری ملازمین کو ریڈیائی تقریریں نشر کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ سوال اصولی طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا گیا جس میں میں خود ملازم تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ تم جس موضوع پر تقریر کرنا چاہتے ہو، اس کا ملخص کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ قربانی کی عید کی تقریب ہے۔ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ انہوں نے شرک کی کس قدر مخالفت کی تھی۔ چونکہ یہ سوال اصولی تھا اور پہلے پہل زیرِ غور آیا تھا اس لئے بات بڑھتے بڑھتے سیکرٹری تک پہنچی۔ وہ (انگریز) سیکرٹری علومِ مشرقی میں بھی کافی درک رکھتا تھا۔ اس نے مجھے بلایا تو میں نے کہا کہ یہ ایک مذہبی تقریب ہے اور شرک جیسا مسئلہ میرا موضوع ہے اس لئے میری تقریر میں کونسی بات ہے جو قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے؟ یہ سن کر وہ مسکرایا اور مجھ سے کہا کہ کیا قرآن مجید کی رُو سے شرک کا یہ مفہوم نہیں کہ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے اور اس کے حقِ حکومت میں کوئی انسان شریک نہیں ہو سکتا۔ اسی کو شرکت کہا جاتا ہے۔ میں اس کی زبان سے یہ سن کر ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا۔ پھر سنبھل کر کہا کہ قرآن مجید کی رو سے حقیقت تو یہی ہے جس پر اس نے کہا کہ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہاری تقریر کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سیاست تو ایک طرف، یہ نظریہ تو ہر حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ (ضمناً۔ اس کے باوجود اس نے مجھے یہ کہہ کر تقریر کرنے کی اجازت دے دی کہ ریڈیو والے تمہاری تقریر کا خود جائزہ لے لیں گے)۔

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہندوستان کے ایک مختصر سے گوشے ہی میں سہی قرآنی اقدار کے مطابق کسی حکومت کا قیام انگریز کے نزدیک کس قدر خطرات کے امکانات اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ چنانچہ لارڈ کرومر نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:-

> اگر مسلمان مملکت آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے۔

(ہفت روزہ ایشیا مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۷۶ء)

واضح رہے کہ یہ شخص اس برطانوی قوم کا نمائندہ تھا جس کی حکومت نے، بغاوتِ ہند کے بعد یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں ہر قوم کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ یعنی مسلمانوں کی مذہبی آزادی کی تو وہ ضمانت دیتے تھے لیکن اسلامی حکومت کے قیام کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ لوگ مذہب اور دین کے فرق کو کتنی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ بنابریں انگریز کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت فطری تھی۔ انگریز نے اس باب میں کیا کچھ کیا اس کی خفیف سی جھلک قائدِ اعظمؒ کے ان بیانات سے لگ سکتی ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً تحریک کے دوران دیئے تھے۔ (مثلاً) انہوں نے بمبئی مسلم لیگ

کی سالانہ کانفرنس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کہا تھا:-

برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی جیت سکتا ہے جس میں قوت ہو۔ لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے!

پھر انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء میں، لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا تھا:-

برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ ہندو کو۔ ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہوا جس سے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہوتی تھی اس بل پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا:-

میں انگریز اور ہندو، دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے، زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو۔ ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو۔ ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔

انہوں نے ۱۹۴۲ء میں یوم پاکستان کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:-

اگر ہندو قیادت یا برطانوی قیادت الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریوں اور سازشوں پر اتر آئیں تو ہم اس کی مدافعت کریں گے تا آنکہ ہم ایک ایک کر کے کٹ کر مر جائیں۔

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسہ عام میں فرمایا:-

ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے۔ خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔

متحدہ سازش

انہی زمانے میں چین میں جنرل چیانگ کائی شک برسراقتدار تھے، جن کے پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوام متحدہ میں لے جایا جائے۔ اسی پر قائداعظمؒ نے نومبر ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھی تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اپنی حفاظت کے لئے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی [illegible] کی امداد نہ کر رہے ہوتے جن کے بنائے میں کانگریس راج رچایا جا رہا ہوگا ہم [illegible]

کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔

پھر انہوں نے جولائی ۱۹۴۶ء میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ دنیا کی کوئی عدالت نہیں جس کے پاس ہم اس کے خلاف اپیل کر سکیں گے۔ دوسری پارٹی کانگریس ہے۔ وہ پوری طرح دوسری قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرے گی۔ اس لئے اب ہم اپنے حفظ و بقا کے لئے آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہیں اور اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ براہ راست اقدام کی تیاریاں اور عمل ہماری پالیسی اور پروگرام کا جزو ہوگا۔

انگریز کی طرف سے مخالفت کا یہ محاذ قریب دس سال تک مسلسل جاری رہا۔ تاآنکہ انہوں نے اپنے آخری حربہ کے طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا۔ اس کی آمد کا مقصد کیا تھا اور اس سلسلے میں اسے قائداعظمؒ کے ہاتھوں کس قدر ذلت آمیز شکست کھانی پڑی، اس کی بابت خود اس کے اپنے الفاظ میں سنیئے۔ ۱۹۶۵ء کے اواخر میں، بی بی سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈ کاسٹ ہوا تھا۔ اس میں اس سے یہ سوال پوچھا گیا کہ جب آپ ہندوستان گئے ہیں تو کیا اس وقت اس کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا:۔

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے، تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناحؒ۔ صدر مسلم لیگ۔ جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔

(طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۷۶ء)

اس محاذ آرائی میں قائداعظمؒ کس جرأت اور بیباکی کا ثبوت دیتے تھے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ لارڈ لن لتھ گو (وائسرائے ہند) اپنے رعب داب، اور دبدبہ و طنطنہ کے لئے مشہور تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی زراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات کو بھی شامل کر لیا۔ قائداعظمؒ نے وار کونسل کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ اس کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائداعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا، لیکن قائداعظم ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود، سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسریگل لاج نہ پہنچے۔

وہاں جاکر، بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں، کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب (INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM) میں لکھا ہے:۔

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں، مسٹر جناحؒ کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے۔ جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جس میں کانگرس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔ (صفحہ ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے، مشہور جریدہ اسٹیٹسمین نے، اپنی ۱۲ جولائی ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ:۔

یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام۔ جنوری ۱۹۶۶ء)

ہندو کی طرف سے مخالفت

اب آیئے مخالفت کے اس محاذ کے دوسرے گوشے کی طرف یعنی یہ کہ ہندوؤں کی طرف سے اس مطالبہ کی مخالفت کس شدت سے ہوئی۔ اس باب میں بھی میں صرف وہ مثالیں پیش کروں گا جن میں ہندوؤں نے یہ کہا تھا کہ ہم مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کی جداگانہ آزاد حکومت کسی صورت میں قائم نہیں ہونے دیں گے۔ یعنی انہیں بھی، انگریز کی طرح، اس پر تو اعتراض نہیں تھا کہ مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو جائے۔ اعتراض اس پر تھا کہ وہ مملکت اسلامی ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگرسی لیڈروں میں، (مہاتما) گاندھی کے بعد، ممتاز ترین پوزیشن حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:۔

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے اُسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ (میری کہانی۔ صفحہ ۱۶۱)

ظاہر ہے کہ "منظم مذہب" سے پنڈت نہرو کا اشارہ اسلام ہی کی طرف تھا کیونکہ یہ انفرادی نجات نہیں بلکہ اجتماعی نظام کا داعی ہے۔ کانگریس کے ایک اور مشہور لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے.....

ایوانِ اسمبلی میں، جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، پکار کر کہا :-

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر کا بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی، اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز - ۱۹۳۸ - ۹ - ۵)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ :-

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہو گا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں، یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔ (ہندوستان ٹائمز - ۲۹ - ۱۱ - ۱۴)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا :-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے ..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن - ۹ - ۱۲ - ۱۹۴۶)

انہوں نے دوسرے مقام پر کہا :-

اگر مذہب کو علیحدہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک۔ سنج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں۔ اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز ۴۰ - ۶ - ۹)

یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا :-

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے

کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت، قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے، مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطّہ، ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون - ۱۹۴۱-۱۱-۲)

لیکن جس طرح اس مخالفت میں انگریز کو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی تھی اسی طرح ہندو کو بھی بُری طرح ناکامی ہوئی اور پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہوگیا۔ اس وقت ہندوؤں کی قلبی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس کہرام سے لگ سکتا ہے جو اس وقت انہوں نے مچایا تھا۔ اس زمانہ کے ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے جولائی ۱۹۴۷ء میں اعلان کیا۔

تقسیم ہند کے وقت

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع اختیار کرنا پڑیں۔

(آرگنائزر - ۴۷-۷-۳)

دیوان چمن لال کا شمار ہندوؤں کے اعتدال پسند طبقہ میں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھائی تھی کہ:-

میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہم تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اپنی قوم کو لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔

(ایضاً)

پاکستان، انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۶ر جون کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے حسبِ ذیل ریزولیشن پاس کیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں، اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

اس مقام پر، میں پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کش مکش کیا تھی۔ کانگریس کا دعویٰ یہ تھا کہ اب سیکولر نظامِ حکومت کا دور آچکا ہے جس کی رُو سے ایک مملکت کے اندر بسنے والے تمام باشندے

ایک قوم شمار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا یہ دعویٰ تھا کہ اسلام کا اپنا نظام ہے جس کی رو سے ایک ہی ملک میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قومیں قرار دیئے جاتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ اسلام کے اس تقاضے کی بنیاد پر ہے۔ کانگریس کے مذکورہ بالا ریزولیشن میں آپ نے دیکھا کہ انہوں نے اسلام کے اس نظریہ کو باطل اور مردود قرار دیا تھا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اس ساری کشمکش کی بنیاد مذہب کے اختلاف پر تھی۔

بہرحال تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا۔ اس فیصلے پر کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو نے دستخط کئے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف قوم سے کہہ رہے تھے:۔

ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہوکر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(PAKISTAN FACES INDIA, PAGE-99)

یہ کچھ ہندوؤں نے تقسیم ہند کے وقت کہا۔ اس کے بعد بھی ان کے سینے میں یہ شعلہ مسلسل بھڑکتا رہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ:۔

پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے (اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ:۔

اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں محترم لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۴۸-۱۰-۲۵)

اس پر اسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ:۔

تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے لیڈروں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگا ..... چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔

راجہ مہندر پرتاپ نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا:۔

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہوگئی ہے۔ بنابریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت - ۵۰-۱۲-۲۱)

پاکستان کو ختم کر دینے کے مذموم مقصد کے حصول کے لئے ہندوستان نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا۔ لیکن اس میں اسے عبرت آموز شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد ہندوستان کے وزیر دفاع مسٹر چوّن نے اپنے بیان میں کہا تھا:۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔

ان مثالوں سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ ہندوؤں کی طرف سے پاکستان کی مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اسے ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ یہاں نظریۂ پاکستان کے مطابق اسلامی حکومت قائم ہو۔ یہ چنگاری ان کے سینے میں ابھی تک سلگ رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کیا۔ وہاں کے موجودہ امور خارجہ کے وزیر، مسٹر باجپائی نے، اُسے درگا دیوی قرار دیتے ہوئے اس کے چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول نچھاور کئے۔ ان تمام مبارک بادیوں کے جواب میں مسز گاندھی نے جو کچھ کہا وہ اس باب میں انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس نے کہا:۔

یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے، حق پر مبنی نظریہ کی اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ اُن کا نظریہ غلط ہے یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

اب مجھے مخالفت کے اس محاذ کے تیسرے گوشے کی طرف آ جانا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ خود مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت کس طرح سے ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے میرے نزدیک ایک اور گوشے کی نقاب کشائی بھی

کمیونسٹ

ضروری ہے۔ اور وہ ہیں کمیونسٹ ——— قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے کراچی کے اجلاس منعقدہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اپنے خطاب کے دوران فرمایا:۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ (کانگریس کے علاوہ) ایک اور، سب سے زیادہ چالاک، جماعت جو ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کر رہی ہے، کمیونسٹ ہیں۔ انہوں نے بہت سے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں ——— اور میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جھنڈوں کی تعداد کی کثرت میں عافیت ہے۔ (قہقہہ) ان کے ہاں سرخ جھنڈا ہے۔ روسی جھنڈا ہے۔ بالشویکی جھنڈا ہے ——— کانگریس کا جھنڈا ہے۔ اور اب وہ (خیر سے) ہمارا جھنڈا بھی ساتھ رکھ رہے ہیں (قہقہہ) جب کوئی شخص بہت سے جھنڈے اٹھائے ہو، تو میں اس کی طرف سے بدگمان ہو جاتا ہوں۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم۔ ص ۴۲)

انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین سے ۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اب کچھ دنوں سے ایک پارٹی بہت متحرک ہو گئی ہے۔ وہ ہیں کمیونسٹ ——— ان کا پراپیگنڈہ بڑا پُر فریب ہے اور میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ ان کے جال میں نہ پھنس جانا۔ ان کا پراپیگنڈہ دامِ ہمرنگِ زمیں ہے۔ ایک خطرناک پھندا ہے۔ وہ سوشلزم، کمیونزم، نیشنل سوشلزم۔ وغیرہ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یاد رکھو! ہمارے ہاں ان "ازمز" یا اس قسم کی کسی اور ازم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔　(تقاریر جناحؒ۔ جلد دوم ص ۴۳)

پھر انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس منعقدہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۴ء کے آخری اجلاس میں فرمایا:۔

یہ کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ ہم بے وقوف ہیں۔ ان کے اس قسم کے مغالطہ میں رہنے کے لئے کچھ وجہ جواز ضرور ہے لیکن (یہ قصّہ ماضی ہے) گذشتہ پانچ دس سال میں مسلمانوں میں ایسی تبدیلی آچکی ہے کہ کمیونسٹ انہیں بے وقوف بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے میں انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر انہوں نے پھر سے وہی کھیل کھیلنا چاہا تو انہیں ایسا منہ توڑ جواب دیا جائے گا (جسے وہ یاد رکھیں گے)۔ ہم مسلم لیگ کے ہلال اور ستارہ کے پرچم کے سوا کوئی پرچم نہیں چاہتے۔ اسلام ہمارا رہنما بھی ہے اور مکمل ضابطہ حیات بھی۔ ہم کوئی زرد یا سرخ جھنڈا نہیں چاہتے۔ ہم کوئی ازم بھی نہیں چاہتے۔

(بحوالہ، نوائے وقت، مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۴۶ء)

قائدِ اعظمؒ کو کمیونسٹ یا سوشلسٹ قرار دینے والے ان اقتباسات کو ذرا غور سے دیکھیں۔

مسلمانوں کی طرف سے مخالفت

اب آیئے اپنے گھر کی طرف یعنی اس طرف کہ خود مسلمانوں نے اسلامی مملکت کے قیام کے لئے خطۂ زمین کے مطالبہ کی کس طرح اور کس شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ اس سلسلہ میں پہلے دو ایک مثالیں ان مسلمان لیڈروں کی لیجئے جو کانگریسیوں کے سیاسی حلقے میں زیادہ مشہور تھے۔ جب مارچ ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے کہا تھا:۔

> میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں، ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۴۰-۴-۷)

اس کی ہمنوائی میں خان بہادر اللہ بخش (مرحوم) نے کہا کہ "یہ اسکیم آزادیٔ ہند کے راستے میں روڑے اٹکاتی ہے"۔ عبدالرحمٰن سرہندی (مرحوم) نے فرمایا۔ "یہ ہندوستان میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کا ذریعہ ہے"۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (مرحوم) نے کہا۔ "یہ اسکیم برطانوی حکومت قائم رکھے گی"۔ مشہور احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (مرحوم) نے کہا۔ "یہ اسکیم ملک کے مفاد کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے بالخصوص نقصان رساں ہے"۔

اور اس کے بعد آیئے اس لشکر کی طرف جو نیزوں پر قرآن لٹکائے اس مطالبہ کے خلاف میدانِ جنگ میں اترا تھا۔ قائدِ اعظم نے جب مجھے تحریکِ پاکستان کی تائید میں ایک ذریعہ ابلاغ کی تجویز پر غور کرنے کے لئے بلایا تو مجھ سے فرمایا تھا کہ انگریز اور ہندو کی طرف سے اس تحریک کی جو مخالفت ہوگی اس سے بآسانی نپٹا جا سکے گا۔ لیکن وہ حضرات جو قال اللہ وقال الرسول کے نعروں کے ساتھ اس کے خلاف نبرد آزما ہوں گے، ان کی مدافعت کے لئے خصوصی توجہ کی ضرورت ہوگی کیونکہ یہ حضرات عوام کو بآسانی ورغلا سکتے ہیں۔ (اسی مقصد کے لئے ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں آیا تھا)۔ اس گروہ میں اُس دَور کے بڑے بڑے جغادری علماء کرام شامل تھے ــــ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور ان کی معیت میں باستثناءِ چند ــــ جملہ علماء دیوبند۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید و دیگر اربابِ جمعیتہ علماء ہند..... اس زمانے میں مسلمانانِ ہند کے دلوں پر ان حضرات کے علم و فضیلت کی کس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی اس کے متعلق

کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا۔ مولانا آزاد کو

مولانا آزاد

ہندوؤں نے محض نمائش کی خاطر کانگریس کا صدر بنا رکھا تھا۔ جن دنوں لاہور میں مسلم لیگ کا سنہ ۱۹۴۰ء کا مشہور اجلاس ہوا تھا، انہی دنوں مولانا آزاد کی صدارت میں پرتاپ گڑھ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے فرمایا کہ:-

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو جھکنے نہیں دیتا۔

یہ اس شخص (مسٹر گاندھی) کے متعلق کہا جا رہا تھا جو بڑے فخر سے اعلان کیا کرتا تھا کہ:-

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں اور اُپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں --- میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جز سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

(بحوالہ خطبۂ صدارت قائد اعظم۔ مسلم لیگ سیشن دلی۔ اپریل ۱۹۴۳ء)

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ اس کے خلاف مولانا آزاد نے اپنے مذکورہ صدر خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ:-

یہ تخیل کہ مسلمان بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں آباد ہیں ---- ایک ہندو اور دوسری مسلمان ---- انگریزوں کا وضع کردہ ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔

جوں جوں تحریک پاکستان مقبول ہوتی گئی اور ہندوؤں نے محسوس کر لیا کہ اس طرح اس مطالبہ کو شکست نہیں دی جا سکتی تو رفتہ رفتہ ان کی مخالفت کی شدت میں کمی آتی گئی۔ لیکن مولانا آزاد آخری دم تک اس میں ویسے ہی متشدد رہے۔ انہوں نے اپنی کتاب (آزادئ ہند) میں خود کہا ہے کہ وہ تقسیم ہند کے اس وقت بھی مخالف تھے جب مہاتما گاندھی سمیت تمام ہندو لیڈر اس پر متفق ہو گئے۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کے مخالف رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ان کی کتاب (INDIA WINS FREEDOM) ہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی۔ وہ اس کتاب میں دو قومی نظریہ کے خلاف اپنے دل کے پھپھولے ان الفاظ میں پھوڑتے ہیں کہ:-

لوگوں سے یہ کہنا کہ زمین کے ایسے قطعوں میں جو جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی لحاظ سے اس قدر مختلف ہوں، مذہبی یگانگت اور وحدت پیدا ہو سکتی ہے بہت بڑا فریب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی برادری متشکل کرنی چاہی تھی جو نسلی، لسانی،

معاشی اور سیاسی حدود سے بلند ہو کر وجود میں آئے لیکن تاریخ سے یہ حقیقت ثابت ہے کہ ایک مختصر سے عرصے کے بعد جسے زیادہ سے زیادہ سو سال کا عرصہ کہئے، اسلام اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ مختلف ملکوں کو دین کی بنیادوں پر ایک وحدت بنا سکے۔ (P. 227)

استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ مولانا آزاد کا کہنا یہ ہے کہ اسلام نے دین کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کی کوشش کی، لیکن وہ تجربہ ناکام رہا۔ اور اب اسے دہرانا حماقت اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا بہت بڑا فریب ہے۔ یہ وہی آزاد ہیں جو مسلمانوں کو برسوں تک یہ دعوت دیتے رہے کہ:

> یہ برادری (یعنی امت مسلمہ کی برادری) خدا کی قائم کی ہوئی برادری ہے ...... دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں مگر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ (الہلال)

علماء دیوبند

ہندوستان میں علماء دیوبند کو خاص مقام حاصل تھا اور وہ اسلام کے صحیح ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ فقہی معاملات میں بے شک ان کا علم بڑا وسیع تھا لیکن جہاں تک اسلام کے سیاسی نظام کا تعلق ہے ان کا نظریہ اسلام کی اصل و اساس کے خلاف تھا۔ وہ مغرب کے جمہوری نظام اور سیکولر حکومت کو عین مطابق اسلام قرار دیتے۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار، مدینہ (بجنور) کی سترہ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں، مولانا اسرار احمد آزاد (دیوبندی) کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:-

> یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

تحریک پاکستان کی بنیاد ہی اس اصل الاصول پر تھی کہ اس خطۂ زمین میں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ علماء دیوبند کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی۔ چنانچہ (باستثناء چند) ان علماء نے اس تحریک کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل تھے اور تحریک پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش۔ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے اور علامہ اقبالؒ کے مابین جو معرکہ برپا ہوا تھا اس کی شہرت عام ہے۔ لہٰذا اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں —— جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے ان کا ارشاد تھا کہ:-

> ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔
>
> (زمزم۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

مذہبی آزادی کے متعلق وہ فرماتے تھے کہ:-

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہبِ اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔

(مولانا مدنی کا پمفلٹ - متحدہ قومیت اور اسلام - صـ۶۱)

ان کی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ حیدر آباد (دکن) کے اخبار "رہبرِ دکن" کی ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی تھی۔

مولانا حسین احمدؒ صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیتے اور قائدِ اعظمؒ کو "کافرِ اعظمؒ" کا لقب دیتے ہوئے حال ہی میں جو فتویٰ دیا تھا اس کا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی نے اپنے ایک مکتوب میں جواب دیا ہے۔

(بحوالہ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء - صـ۱۰۱۲)

مفتی محمود

ضمناً مفتی محمود (مرحوم) انہی مولانا مدنی (مرحوم) کے شاگرد تھے۔ یہ اُس جمعیت العلماء ہند کے ایک اہم رکن تھے جس کے صدر مولانا مدنیؒ تھے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی باک نہیں سمجھتے تھے کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مثلاً نوائے وقت نے اپنی اشاعت بابت ۲۷ر ستمبر ۱۹۷۷ء کے اداریہ میں لکھا تھا:-

قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود اس معاصر سے اپنے خصوصی انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خود مختاری میں مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر محفوظ سمجھتے تھے اس لئے تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔

اسی طرح انہوں نے، خان عبدالقیوم خان کے ایک الزام کے جواب میں کہا تھا کہ "میں نے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔" (نوائے وقت، ۲۰ر ستمبر ۱۹۷۷ء) جمعیت علماء پاکستان کے سینئر نائب صدر سید محمود شاہ گجراتی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ:-

مولانا مفتی محمود نے خود پی، این، اے کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ (روزنامہ مشرق مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۷ء)

یعنی پاکستان قائم کرنے کے گناہ میں تو شامل نہیں تھے لیکن اس "گناہ کے حاصل" (مملکت پاکستان) کے مفادات کو زیادہ سے زیادہ بٹورنے کے لئے بھرپور کوشش کرتے تھے اور اسی میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔

مولانا نورانی

علمائے دیوبند کے بعد ہمارے سامنے مولانا احمد رضا خان بریلوی (مرحوم) کے متبعین آتے ہیں۔ جمعیت العلمائے پاکستان کے صدر مولانا احمد شاہ نورانی اسی فرقہ کے نمائندے ہیں۔ اس فرقہ کی طرف سے صادر کردہ فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ:-

بحکمِ شریعت، مسٹر جناح اپنے ان عقائدِ کفریہ، قطعیہ، یقینیہ کی بناء پر قطعاً مرتد اور خارج

اندا اسلام ہے۔ اور جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا ان کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر مرتد اور مستحق لعنت ہے اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت عزیز علام

(تجانب اہلسنۃ عن اہل الفتنۃ - صـ ۱۲۲)

اسی فرقہ کے ایک ممتاز عالم، مولانا اولادِ رسول نے ایک رسالہ "الجوابات السنیہ" شائع کیا۔ اس میں حزب الاحناف (لاہور) کے مولانا ابوالبرکات سید احمد (مرحوم) کا یہ فتویٰ درج تھا کہ:-

لیگ کی حمایت کرنا۔ اس میں چندے دینا۔ اس کا ممبر بننا۔ اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔

ان علماء کے علاوہ مجلسِ احرار بھی تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں بڑی متشدد تھی۔ یہ رسوائے زمانہ شعر اسی مجلس کے ایک ممتاز لیڈر (مولانا) مظہر علی اظہر کا ہے۔

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم (معاذ اللہ)

حالانکہ یہ الزام واقعہ کے بھی یکسر خلاف تھا۔ اسی مجلسِ احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۶ء میں ایک قرارداد پاس کی تھی جس میں کہا تھا کہ:-

یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفتوں کا یہ ہجوم بھی کچھ کم صبر آزما اور ہمت شکن نہیں تھا لیکن اس کے بعد، میں جس مخالفت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس کی زہر فشانیوں کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ اگر اس کی مدافعت کے لئے قائدِ اعظمؒ جیسا دشمنی کا مینارہ نہ ہوتا تو یہ سیلابِ بلا اس سفینۂ برگِ گل کو واقعی لے ڈوبتا۔ یہ مخالفت تھی سید ابو الاعلیٰ

مودودی صاحب

مودودی (مرحوم) کی طرف سے۔ وہ بڑی گہری سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق مخالفت کے اس میدان میں نبرد آزما ہوئے تھے۔ انکی سیاسی زندگی کا آغاز ایک نیشنلسٹ صحافی کی شکل میں ہوا۔ وہ قریب پانچ چھ سال تک جمعیتہ العلماء ہند کے اخبار "الجمعیۃ" سے وابستہ رہے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کی سوانح عمری بھی لکھی۔ جب اس اخبار کی مالی حالت خراب ہوگئی تو وہ اپنے برادر بزرگ مولانا ابوالخیر صاحب کے پاس حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ وہیں انہوں نے اپنی اسکیم کی بنیادی اینٹ رکھی۔ اس زمانے میں علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ "دو قومی نظریہ" کا شہرہ عام ہو رہا تھا اور اس سے تحریکِ پاکستان کے لئے فضا ہموار ہوتی چلی جارہی تھی۔ مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں اس نظریہ کی تائید میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ اس طرح انہوں نے شمالی ہندوستان کے اقبالی حلقہ میں مقبولیت حاصل کرلی اور یہی چیز ان کے حیدر آباد سے پٹھانکوٹ منتقل ہونے کا موجب بنی۔ (میں اس تفصیل کو اپنے ایک مبسوط خطاب میں بیان کرچکا ہوں جو طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں پیش کیا گیا تھا اور جسے بعد میں "گھر، ساز شیں"

کے عنوان سے پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا تھا)۔ میں اس مقام پر اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس طرح مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے متفقین کے ذہنوں میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ پراپیگنڈہ کے فن میں ماہر تھے اور ان کی اسکیمیں بڑی لطیف اور دوررس ہوتی تھیں۔ یوں انہوں نے قوم کے ہاں وہ اعتماد حاصل کر لیا جو نیشنلسٹ علماء کھو چکے تھے۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہی کچھ کرنا شروع کر دیا جو کانگریسی علماء کرنا چاہتے تھے۔

تحریکِ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اور یہ قوم ایک الگ مملکت قائم کرنے کا حق رکھتی ہے جس میں یہ اسلامی حکومت قائم کر سکے۔ مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہ نظریہ عین مطابقِ اسلام ہے کہ قومیت کا مدار ایمان کے اشتراک پر ہے اور اس بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایک جداگانہ قوم قرار پاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان ہیں کہاں جنہیں ایک قوم قرار دیا جا سکے۔ موجودہ مسلمانوں کو مسلمان فرض کر لینا بہت بڑی مغالطہ آفرینی ہے۔ ان کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" ان کے اسی قسم کے دعاوی سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً اس میں انہوں نے لکھا کہ :-

> یہ انبوہِ عظیم، جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اُسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی غلط فہمی قابلِ داد ہے .... ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا، اسلامی اصول ہی پر ہو گا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ (جلد سوم - صـ ۱۳۰)

> یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ (جلد سوم - صـ ۱۶۶)

> اِن وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد، جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اِس تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (جلد سوم - صـ ۵۶)

اگر آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں، اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے۔ (جلد سوم۔ صـ۱۶۷)

اس کتاب میں انہوں نے مسلم لیگ کے قائدین کو مخاطب کر کے لکھا:۔

اگر یہ آپ کی قومیت ہے اور یہ آپ کی کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے ..... اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا پر رکھ رہے ہیں، اوّلاً اسلام کے خلاف ہیں بلکہ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لئے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ (جلد سوم۔ صـ۴۶) ..... جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کریں، ہم ان کا راستہ روکنے نہیں آتے۔ ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

(جلد سوم۔ صـ۷۰)

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ جو کچھ کانگرسی علماء کھلے بندوں کہتے تھے بعینہٖ وہی کچھ مودودی صاحب اپنی نقاب پوش اسکیم کے تابع کہتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق مودودی صاحب جو کچھ کہتے تھے آپ نے سُن لیا ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ اجلاس ۱۳۴۸ھ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں مولانا شاہ معین الدین اجمیریؒ (مرحوم) نے تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا:۔

اگر اس کا (اسلام یا مسلم کا) مفہوم صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک قوم یا مخصوص نسل کا نام یا عنوان ہے تو جیسا کہ عرض کیا گیا ہے ہر ایک نا آشنائے مذہب کے ہاتھ میں 'اسلام' یا 'مسلم' کی باگ دی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس قوم کا جو مسلمان کہلاتی ہے بحیثیت قوم ہونے کے خیر خواہ اور مخلص ہو۔ لیکن اگر اسلام کا تعلق عقائد و اعمال سے ہے اور ان کے فقدان سے اسلام پر اثر پڑ سکتا ہے تو ایسی حالت میں مسلمانوں کا قائد وہی ہونا چاہیئے جس میں یہ مذہبی روح موجود ہو اور جو غیر ضروری وسیع الخیالیوں کی آمیزش و اختلاط سے کمزور اور فنا نہ ہو گئی ہو ورنہ اس کی قیادت میں جو ترقی ہوگی وہ درحقیقت اسلام یا مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ اس کا تعلق قوم یا ملک سے ہوگا جس کی پرستش اس عہد میں اعلیٰ درجہ کی روشن خیالی سمجھی جا رہی ہے۔ ایسی ترقی بعض اوقات اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سخت مضر بلکہ عذابِ الٰہی کی صورت میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اسی ترقی کی فضا میں فروعی اعمال اور جزئی عقائد

بجائے خود رہے اسلام کے اصول اور ضروری شعائر تک کے متعلق غیر ضروری ہونے کا فتویٰ قابو یافتہ جماعت کی جانب سے صادر ہونے میں تامل نہیں ہوتا اور اسی طرح بتدریج تمام اسلامی بندشوں کو توڑ دینے کا سلسلہ قائم کر دیا جاتا ہے۔

(پمفلٹ "اشرف الافادات" شائع کردہ۔ مرکزیہ جمعیۃ العلماء ہند۔ مئی ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۱۳)

آپ دیکھئے کہ جو کچھ کانگرسی علماء کہتے تھے اسی کا چربہ مودودی صاحب پیش فرما رہے تھے۔ گویا مودودی صاحب اسی نغمہ کی صدائے بازگشت تھے۔

عام ہندوستانی مسلمانوں سے آگے بڑھ کر مودودی صاحب کے نشتر کا ہدف، خود قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کے دوسرے راہنما تھے۔ ان کے خلاف انہوں نے اس قدر زہر اگلا تھا کہ اس کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک ضخیم تالیف کی ضرورت ہوگی۔ وہ بار بار لکھتے تھے:۔

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی ..... نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۳۷) ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ (جلد سوم صفحہ ۷) ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۴۷) ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ کعبہ کدھر ہے۔ اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دو فیصدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۷۷)

وہ اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

نہ ان کی جماعت، اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت، اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے۔ نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۸۲)

اب آپ دیکھئے کہ مسلم لیگ کی قیادت کے متعلق نیشنلسٹ علماء کیا کہتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا:۔

پس جس جماعت میں زندیقوں اور دہریوں کی بھرمار ہو۔ اور جس کے اربابِ بست و کشاد کی

سرشت میں مغربی تہذیب اور مغربی تمدن اور مغربی معاشرت طبیعت ثانیہ بن چکی ہو' وہ اسلامی جماعت اور سوادِ اعظم اور شرعی تنظیم کیسے قرار دی جا سکتی ہے اور اس جماعت سے اصلاح قوم اور ترقیٔ اسلام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے ...... افسوس کہ مسلمانوں کی نکیل اور باگ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام کے دوست نما دشمن ہیں۔ وہ علمِ دین، دینی فہم، عقل، سب سے معرّا ہیں۔ اور جب وہ خود گم کردہ راہ ہیں' دوسروں کو کیا راہ بتائیں گے .... ان کی حالت یہ ہے کہ صورت سے بھی مسلمان کہلانے کے قابل نہیں۔

(پمفلٹ۔ اشرف الافادات۔ صفحہ ۱۰)

سوچئے کہ قائدِ اعظمؒ بلکہ مسلم لیگ کی پوری کی پوری قیادت کے خلاف جو الزامات مودودی صاحب عائد کر کے قوم کو ان سے برگشتہ کرتے تھے ان میں اور ان الزامات میں جو کانگرسی علماء تراشتے تھے، ذرا سا بھی فرق ہے! ان حقائق سے واضح ہے کہ مودودی صاحب اور ان کی جماعت درحقیقت کانگرسی علماء ہی کی ایک شاخ تھی جو ایک مقدس نقاب اوڑھ کر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے لئے نئے راستوں سے میدان میں آئی تھی۔ ان کی طرف سے یہ مخالفت تقسیمِ ہند کے زمانے تک مسلسل جاری رہی حتیٰ کہ جب اصولی طور پر تشکیلِ پاکستان کا فیصلہ ہو گیا تو انہوں نے اپنے تیروں کا رُخ ان صوبوں کی طرف موڑا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ وہاں جا کر جلسے منعقد کئے اور ان سے کہا کہ اگر پاکستان بن گیا تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے اس لئے اب بھی وقت ہے کہ تم اس مطالبہ کی مخالفت کرو۔ میں یہ تفاصیل بھی گذشتہ تیس برس سے پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لہٰذا، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے پمفلٹ "گہری سازش" شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام)۔

یہ تھا تحریکِ پاکستان کی مخالفتوں کا ہجوم جن کا مقابلہ قائدِ اعظمؒ تن تنہا کر رہے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحریک کے ہم نوا لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے لیکن ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ فوج کے سپاہیوں کی سی تھی۔ ان کے کمانڈر صرف ایک ہی تھے۔ انہوں نے یہ جنگ کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی اس کا اعلان انہوں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں "عربک کالج دہلی" میں ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا تھا۔

اورنگ زیب روڈ نئی دہلی پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹیریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں۔ میرا اسلحہ خانہ اس قدر ہے ـــــ ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کر کے دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر اور پرسنل اسسٹنٹ ـــــ بس یہ ہے ہمارا ساز و سامان اور اسلحہ اور فوج۔

(پمفلٹ۔ عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار۔ صفحہ ۲۱)

حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف مطالبۂ پاکستان کی صداقت اور اس مردِ مجاہد کے کردار کی پاکیزگی اور بلندی تھی جس

سے انگریز، ہندو اور خود "اسلام" کے علمبردار مسلمان لیڈروں کی پیہم درمتذکرہ مخالفتوں کے علی الرغم اس جنگ میں ایسی شاندار کامیابی نصیب ہوئی اور یہ جانباز، ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید کے بغیر، ایسی عظیم مملکت قوم کو دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا، اُس مہلک عارضہ کے ہاتھوں جسے انہوں نے برسوں تک اس لئے اپنے سینے میں چھپائے رکھا کہ اگر دشمنوں کو اس کا علم ہو گیا تو وہ ان کی موت کے انتظار میں اس جنگ کو طول دیتے جائیں گے۔ یہ قربانی کی انتہا تھی؟

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تشکیلِ پاکستان کے بعد

یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ جن عناصر نے تحریکِ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ ہجوم کر کے پاکستان آ گئے۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ یہ قائدِ اعظمؒ کی کشادہ ظرفی تھی کہ انہوں نے انہیں پاکستان آنے سے روکا نہیں، یا جن گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں میں وہ اس وقت گھرے ہوئے تھے ان کی وجہ سے انہیں اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی۔ وجہ کچھ بھی ہو، یہ خطرہ بڑا مہیب تھا جس کے لئے یہاں کے دروازے کھول دیئے گئے ——

پاکستان میں دیگر عناصر نے تو اس کا اعتراف بھی کیا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ تحیّر انگیز تماشہ کہیں اور نہیں دیکھا ہو گا کہ جس جماعت نے اس میں انتہا کر دی تھی وہ برابر کہے جا رہی ہے کہ ہم نے اس تحریک اور مطالبہ کی مخالفت نہیں کی تھی۔ ایسا کہنے میں بھی انہوں نے اپنی مخصوص تکنیک سے کام لیا ہے۔ ستمبر ۱۹۷۷ء میں پاکستان ٹائمز کے نمائندہ نے مودودی (مرحوم) کا ایک انٹرویو لیا جس میں ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:-

> ہمارے لئے اصل بات یہ ہے کہ اگر ہمیں ایک گز زمین ایسی مل جائے جہاں خدا کی مشیت کا غلبہ ہو تو وہ خطہ دوسروں سے زیادہ مقدس ہو گا۔ ہم چاہتے تھے کہ پورا ہندوستان سرزمینِ اسلام ہو، لہٰذا، ہم اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملک کی مخالفت کس طرح کر سکتے تھے؟ لیکن جو لوگ تحریکِ پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے وہ ہمیں سچے مسلمان نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دلوں میں اس تحریک (کے اسلامی ہونے) کے متعلق شکوک کی یہ وجہ تھی۔ ہم قائدِ اعظمؒ ہی کے خلاف نہیں تھے۔ ہم اس پوری کی پوری قیادت کے خلاف تھے جو تحریکِ پاکستان کو چلا رہی تھی۔ جب پاکستان قائم ہو گیا تو ہم نے اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد جاری رکھی۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۷۷-۹-۲۵)

اس منطق کی ابلہ فریبی غور طلب ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ ہم نے اس تحریک کے قائدین کے خلاف پروپیگنڈہ کیا تھا۔ اس مغالطہ آفرینی توجیہہ کا تجزیہ ایک مثال کی رو سے کیجئے۔

ایک شخص مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے دیگر مقتدر لیڈروں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ بدکردار ہیں، بداخلاق ہیں، بدنیت ہیں، فریب کار ہیں، منافق ہیں، اسلام کے دشمن ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب اس سے کہا جائے کہ تم جماعتِ اسلامی کی مخالفت کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہے کہ میں جماعتِ اسلامی کی مخالفت تھوڑا کرتا ہوں۔ میں تو صرف اس جماعت کی قیادت کو ہدفِ طعن و تشنیع قرار دیتا ہوں۔ کہیئے کہ ایسا جواب دینے والے کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ (بلاتشبیہ) ذرا آگے بڑھیئے۔ مغرب کے متعصب مستشرقین کی تکنیک یہ ہے کہ وہ براہِ راست اسلام پر حملہ نہیں کرتے بلکہ حضورؐ نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کو داغدار بنانے کی سعیِ مذموم کرتے رہتے ہیں۔ آپ سوچیئے کہ ان کے اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اگر کوئی شخص (معاذ اللہ ہزار بار معاذ اللہ) حضورؐ کو فریب کار سمجھ لے تو کیا وہ اسلام کو ایک سچا دین تصور کرے گا؟ ——— ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی تحریک کی مخالفت کے لئے مؤثر ترین حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس تحریک کے قائدین کے کیریکٹر کو گھناؤنا کر دیا جائے۔ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کے قائدین کے خلاف پروپیگنڈہ اس تحریک کے دوران ہی جاری نہیں رکھا تھا۔ انہوں نے انہیں تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی نہیں بخشا۔ ان کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کا پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے تقسیمِ ہند کی داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

> یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے باوجود اپنے آپ کو اسلامی نظام کی اقامت کا سب سے بڑا داعی قرار دیتے اور اس مملکت کو اسلامی بنانے کی جدوجہد کا سب سے بڑا مجاہد ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مملکت کے اسلامی بننے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی صاحب تھے۔ بسطِ بیں نگاہوں کو (بالخصوص انہیں جو ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہیں) یہ بات اعجوبہ سی نظر آئے گی۔ لیکن جو حضرات ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیں گے انہیں اس حقیقت کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہو گی۔ یہ نکتہ بھی تفصیل طلب ہے لیکن قلتِ وقت کی وجہ سے میں اس کے صرف ایک گوشے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران مودودی صاحب سے کہا جاتا تھا کہ اس وقت ساری جنگ ایک ایسے قطعۂ زمین حاصل کرنے کے لئے ہے جس میں اسلامی مملکت قائم کرنے کا امکان ہو۔ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے:۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اُس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (سیاسی کشمکش۔ جلد سوم۔ ص ۱۶۸)

اسلامی مملکت

یعنی وہ بظاہر تو یہ کہتے تھے کہ ایسی مملکت اسلامی بن نہیں سکے گی، لیکن درحقیقت ان کا مطلب یہ تھا کہ تم ایسا خطۂ زمین حاصل کرلو۔ پھر میں دیکھوں گا کہ اس میں کس طرح اسلامی مملکت قائم ہوسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں وہ گذشتہ تیس سال سے کیا کرتے چلے آرہے ہیں اسے گہری نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے پہلا دعویٰ یہ کیا کہ یہ مملکت اسلامی اسی صورت میں بن سکتی ہے جب یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ اس کے بعد کہا کہ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ضابطۂ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح کوئی ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہر حکومت کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ یہ لوگ اسلامی قوانین نافذ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ زمانے کے تقاضے ملاحظہ ہوں کہ انہیں بیس سال کے مسلسل پروپیگنڈہ کے بعد اس کا اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ:۔

> کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔
>
> (ایشیا ۔ مورخہ ۲۳ راگست سنہ ۱۹۷۰ء)

اور یہ معلوم کرکے آپ حیران ہوں گے کہ یہ حضرات اس کے بعد بھی برابر یہ مطالبہ کئے جا رہے ہیں کہ پبلک لاز کا ضابطۂ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔

اس ایک نشانے سے دو شکار مارے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس معیار کے مطابق نہ اسلامی قوانین مرتب ہوں گے، نہ یہ مملکت اسلامی بن سکے گی۔ اور دوسرا یہ کہ اس سے، جس حکومت کے خلاف جی چاہے پروپیگنڈہ کیا جاسکے گا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے سنہ ۱۹۷۶ء میں منعقد کی جانے والی وکلاء کانفرنس میں کہا تھا۔

> یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی گئیں اور یہ حاصل اس لئے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی قوانین نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لاالٰہ الا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں کی جائیدادیں تباہ کروا دیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہوا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا جس کے لئے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہوسکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے مگر پھر ارادہ کرلیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔
>
> (ایشیا ۔ مورخہ ۹ رمئی سنہ ۱۹۷۶ء)

اس میں البتہ ایک گنجائش رکھ لی گئی۔ فرمایا:۔

> میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قوانین کا نفاذ اگر ہوسکتا ہے تو صرف

اقتدار مجھے دو

اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ تحریکِ پاکستان کی دوسری مخالف جماعت، جمعیۃ العلماءِ ہند تھی جس کے نمائندہ مفتی محمود صاحب ہیں۔ یہ پاکستان میں آ تو گئے ہیں لیکن انہوں نے اسے ابھی تک دل سے قبول نہیں کیا۔ یہ محض ہمارا قیاس نہیں، حقیقت ہے جس کے ثبوت میں چند مثالیں پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ ان میں ایک اور کا اضافہ کر لیجئے۔ حال ہی میں، مولانا نورانی صاحب نے ملتان میں کہا ہے کہ:-

> متحدہ محاذ کے سربراہ، مفتی محمود صاحب نے ابھی تک پاکستان کو قبول نہیں کیا اور وہ چاہتے ہی نہیں کہ یہ مستحکم ہو۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ ۲۱ جولائی ۱۹۷۸ء)

یہ ہیں وہ حضرات جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ناکام رہنے کے بعد یہاں آ گئے کہ جو کچھ وہاں نہیں کیا جا سکا تھا، یہاں آ کر کر لیا جائے۔

موجودہ حالت

عزیزانِ من! میں نے اس درس کا آغاز سورۂ انفال کی اس آیت سے کیا تھا جس میں جماعتِ مومنین کی مدنی زندگی میں ان سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی سابقہ حالت پر غور کرو۔ تم وہاں اقلیت میں تھے اور کمزور بھی تصور کئے جاتے تھے۔ خدا نے تمہیں اپنی عنایات سے نوازا۔ تمہیں رہنے کے لئے نہایت محکم ٹھکانا دیا۔ قوت و شوکت عطا کی۔ نشو و نما کا نہایت خوشگوار سامان ارزانی فرمایا۔ یہ سب انعامات اس لئے عطا کئے کہ دینِ خداوندی کو متمکن کرنے کے لئے تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر سکیں۔ اس سلسلے میں انہیں کچھ مثبت ہدایات دی گئیں کچھ منفی۔ مثبت ہدایات کے سلسلے میں کہا کہ:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)

اے جماعتِ مومنین! جب اللہ اور اس کا رسول تمہیں اس بات کی طرف بلائے جس میں تمہاری حقیقی زندگی کا راز پوشیدہ ہے تو تم اس کی دعوت پر لبیک کہا کرو۔

یہ مثبت تاکید تھی۔ دوسری طرف یہ فرمایا کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (۸/۲۷)

اے جماعتِ مومنین! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم نہ تو اس نظامِ خداوندی سے خیانت کرو جس کے لئے تمہیں یہ نعمتیں دی گئی ہیں اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں خیانت کرو جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟

اور اس نتیجہ کی وضاحت بھی یہ کہہ کر خود ہی کر دی کہ:۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)

یاد رکھو، اس قسم کی خیانتوں سے وہ تباہی آتی ہے جو حکومت کے ظالم طبقے تک ہی محدود نہیں رہا کرتی، سارے کے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات اپنی نتیجہ خیزیوں میں بڑا سخت واقع ہوا ہے۔ تم ایسا انتظام کرو کہ اس قسم کی تباہی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

تیس برس کی مسلسل اجتماعی اور انفرادی خیانتوں سے ہم آج اس مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں خدا کی یہ تنبیہہ آنے والے خطرات سے ہمیں پکار پکار کر آگاہ کر رہی ہے۔

فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (۵۴/۱۵)

کیا کوئی ہے جو اس نوشتہ دیوار سے عبرت حاصل کر لے؟

اگر نہیں، تو پھر یاد رکھو کہ: ع

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ضروری وضاحت

یہ خطاب ۱۹۷۹ء میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں جن ایسی شخصیتوں کا ذکر آگیا ہے جو اب مرحوم ہو چکی ہیں، ان کے نام کے ساتھ (مرحوم) کا اضافہ کر لیا جائے۔ اسی طرح اس میں پیش کردہ بعض واقعات کا مطالعہ بھی اسی حقیقت کی روشنی میں کیا جائے۔ (طلوعِ اسلام)

معذرت

محترم پرویز صاحب سابقہ ماہ سے صاحبِ فراش ہیں۔ اس دوران میں قارئین کی طرف سے حسبِ سابق انہیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ وہ معذرت خواہ ہیں کہ تا بحالیٔ صحت تک ان کے جوابات نہیں دے سکتے۔ (طلوعِ اسلام)

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک منبعِ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ اس کتاب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے (۴) کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ اور بہترین نمونہ ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی مخلوقی سے نجات دلا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (بمعنی نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اور مملکت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے

عرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گڈمڈ ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرکے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقۂ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درسِ قرآن کریم

محترم پرویز صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ مرکزی درسگاہ تو ادارہ طلوعِ اسلام (B/۲۵۔ گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (باقاعدہ) ہر جمعہ کی صبح ۹½ بجے شروع ہوتا ہے لیکن اندرونِ پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے۔ حسبِ ذیل مقامات پر یہ (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے۔

کراچی:۔ ہر جمعہ ۹½ بجے صبح دارالزہرہ بالائی منزل بالمقابل شاپ نمبر ۲ مسعود روڈ (کراچی صدر)	**گجرات**:۔ ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جناح کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر ۳۲۰۳ + ۳۲۰۰
اوسلو (ناروے) ہر اتوار شام ۵ بجے بمقام:۔ JINNAH HALL, KEYSERS GATE-I OSLO-I زیرِ انتظام زاہد صفدر صاحب ٹیلیفون نمبر 306188—674040	**فریڈرکستاد** (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار شام ۴ بجے بمقام: ARNE SVENDSENS-GATE-2, 1600 FREDRIKSTAD, NORWAY TEL: (032) 10287/22862
لندن (یوکے) ہر ماہ کے آخری اتوار ۲ بجے بعد دوپہر بمقام 47 HURLEY ROAD GREEN FORD MIDDLE SEX TEL: 01—578—5631	**برمنگھم** (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر 227/229 ALUM ROCK ROAD 38 _ 3BH (BIRMINGHAM)
ٹورنٹو (کینیڈا) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح 335 DRIFT WOOD AVE: #311, DOWNS VIEW, TORONTO (ONT.) M3N—2P3, TEL: (416) 661—2827	**ملتان**:۔ ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ فون نمبر (۳۱۰۶۱)

لندن یوکے	ہر ماہ کے دوسرے اتوار	39 MANSELL RD GREENFORD MIDDLE SEX TEL: 01—575—5862

اور ذیل کے مقامات پر عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لاہور	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ نزد پولیس سٹیشن فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲½ بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No. 553 — 1896
پشاور چھاؤنی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب، رفیقی لین صدر (بالمقابل VIP MAINGATE PESHAWAR STADIUM) بارہ روڈ فون:۔ ۷۲۴۵۹
پشاور	جمعہ ۹ بجے صبح	شیریں محل B-3 یونیورسٹی ٹاؤن

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس مع کوائف
مردان	جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ۔
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	مجلس۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ لیہ
سرگودھا	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، عثمان منزل ۴۔ نظامی منزل
فیصل آباد	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	حیات سرجری کلینک ۔ ۲۳/۲ پیپلز کالونی ۲ فون نمبر :۔ ۲۲۸۵۵
ہنگو	جمعہ ½۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے اسٹیشن روڈ۔ فون نمبر (۹۷)
بھکی تحصیل کبیروالا ملتان	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	مطب حکیم احمدالدین صاحب (نمائندہ بزم)
بہاولپور	جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی جراحی شفاخانہ، مستی پورہ، با اہتمام (ڈاکٹر سعید محمد اعظم خان صاحب ۔ بائی پاس روڈ بہاولپور)
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ با اہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر ماہ کا پہلا جمعہ بعد نماز جمعہ درسِ قرآن کریم بذریعہ وی سی آر۔ ہر ماہ کے بقیہ جمعہ بعد نماز جمعہ حسبِ معمول کیسٹ پر	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت صاحب گلی نمبر ۵ سول لائنز
گجرات	بعد نماز جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱۱/۱ بی۔ جمبر روڈ۔ با اہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	(۱) جمعہ ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ : صلاح الدین صاحب، واقع 234-K کہیال (ایبٹ آباد)
〃	(۲) اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ غلام مصطفیٰ اعوان صاحب K-356 کینٹ گراؤنڈ (ایبٹ آباد)
بوریوالہ	ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا جمعہ بعد نماز جمعہ	بمکان محمد اسلم صابر، مرضی پورہ گلی نمبر ۳ تیسرا چوک ملتان روڈ بوریوالہ
سرگودھا	ہر جمعہ صبح ۹ بجے	رہائش گاہ ارشد محمود ارشد A/6 سول لائن ریلوے روڈ سرگودھا (مابین نیلام سینما اور شمع سینما بین ریلوے روڈ پر واقع ہے)۔ (فون نمبر ۲۵۱۹)